خواب لے لو خواب

شاہد حسین

خواب لے لو خواب

For,
My dear friend and comrade
Sohail Sanghi
With love and regards,
Shahid Husain

Karachi, July 9, 2014 شاہد حسین

مکتبۂ دانیال

انتساب

نسرین

اور

اپنے بچوں زویا، طٰہٰ اور علیزہ

کے نام

فہرست عنوانات

خواب لے لو خواب .... عباس رضوی 7
شب سُست موج کا ساحل .... خورشید حسنین 17
تبصرہ - بے مقصد سے خیالات ... عابد 20
آنکھیں.. 22
رات.. 25
چوہے.. 26
تنہائی.. 27
دھوپ.. 29
سانپ.. 31
ناک.. 32
زمانۂ طالب علمی.. 37
پہلی نوکری.. 48
ہمارے فوجی.. 54
کمال ہوگیا... 60
آپ کہیں جائیں گے نہیں.. 68
روانگی.. 71
دوا... 77

جوتا 79
چھوٹے پویا 80
سب ایڈیٹر 81
بھول 88
ایک سچا انقلابی ــــ سیّد سبط حسن 87
ممتاز نورانی 94
سلیم عاصمی 97
انور احسن صدیقی 99
لال بخش رِند 102
ڈاکٹر قمر عباس ندیم 107
ہادی نقوی 111
انور پیرزادہ 113
پاتال میں بغاوت (منیر مانک) 116
''مونس'' 120
پال براؤن (Paul Brown) 122
نخبت ہمیں سونے نہیں دیتیں 130
احساسِ جرم 135

خواب لے لو خواب

شاہد حسین اپنی تصنیف ''مفت لے لو خواب'' کو یادداشت (Memories) تصور نہیں کرتے۔ انہیں کہانیوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں ۔ دلیل اس کی دیتے ہیں کہ ''مفت لے لو خواب'' کے متون (text) خواب وحقیقت کے بیک وقت غماز ہیں، یعنی نہ تو وہ صرف حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور نہ صرف خواب کی ترجمانی۔ شاہد حسین کے اپنے الفاظ میں، سب کے سب ''جاگتے خواب'' ہیں جنہیں ''وہ بچپن ہی سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔'' ہمارا گردو پیش اگر بنی بنائی اشیا کا مجموعہ نہیں ہے، بنتی بگڑتی ہوئی اشیا ومظاہر کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ تو پھر جو کل تھا اس کی خبر کل والوں سے ہی مل سکتی ہے۔ جو کل ہوگا اس کا پتہ وہی بتا سکتے ہیں جو کل دیکھیں گے۔ غالب کے الفاظ میں آج اگر ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے'' کے مانند یا مارکس کی اصطلاح میں states of becoming ہے تو پھر ایسی صورت میں اس کے متعلق حتمی طور پر کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ جانے کب کون سی حقیقت خواب یا کون سا خواب حقیقت ثابت ہو جائے!

Jeremy Hawthorn (جرمی ہادرن) اپنی تصنیف Unlocking The Text (تفہیم متن) میں لکھتا ہے کہ متن کی معنویت کا تعین صرف مصنف، عام قاری، اور نقاد کی قرات سے نہیں ہوتا، اس ادبی پس منظر (literary Context) اور حرکی سماجی تاریخی تناظر (dynamic socio-historical context) سے بھی ہوتا ہے

جس کے تحت وہ تخلیق کیا جاتا ہے۔

شاہد حسین اپنی کتاب کو یادداشتوں کا مجموعہ تصور کریں یا کہانیوں کا۔ اس میں جمع متون کی تفہیم کے لئے ہمیں ان کے ''ادبی پس منظر'' اور ''حرکی سماجی تاریخی تناظر'' کو بھی دیکھنا ہوگا۔

شاہد حسین کہتے ہیں کہ انہوں نے اسکول کے زمانے ہی میں خاصہ اُردو ادب پڑھ لیا تھا۔ کرشن چندر ہوں یا کہ بیدی، جانثار اختر ہوں یا جوش، فراق ہوں یا فیض، مجاز ہوں یا منٹو یا عصمت چغتائی، شاہد حسین ان کی کم و بیش تمام تصانیف کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ''سامراج دشمنی تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔''

شاہد حسین کے بقول ان کی پیدائش 14 ستمبر 1950ء کو ہندوستان کے شہر بھوپال میں ایک علمی ادبی گھرانے میں ہوئی اور غالباً 1952ء میں ہجرت کر کے براستہ بمبئی پنجاب پہنچے۔ ان کے والد کی اوّلین پوسٹنگ خانیوال اور اس کے اطراف کے شہروں میں ہوئی۔ پنجاب میں اگرچہ ان کا قیام نہایت مختصر رہا، تاہم وہاں کے انگ کا اتنا رنگ تو ان پر چڑھ ہی گیا کہ وہ اپنے ماموں زاد بھائی، حسن مہدی کو ''کاکا'' کہہ کر پکارنے لگے جو آج بھی اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔

شاہد حسین اگر پنجاب ہی میں رہ جاتے تو گمان غالب ہے کہ وہ ''اسکول'' کو ''سکول'' کہنے اور حروف ''ک'' اور ''ق'' میں تمیز پیدا کرنے کے لئے ''کتے والی ک اور قینچی والی ق'' کی تمثیل کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔ لیکن شاہد حسین چند سال بعد ہی پنجاب سے کراچی چلے آئے اور یہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔

واضح رہے کہ ماضی میں کولاچی کے نام سے پکارے جانے والا شہر کراچی سندھ کی سرزمین پر واقع ہے جو ایک زمانے سے سماجی سیاسی (Socio-Political) تغیرات کا شکار رہی ہے۔ ان تغیرات کا تفصیلی تذکرہ ایک الگ کہانی ہے۔ فی الحال

اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سندھ برطانوی سامراج کے زیر نگیں آنے اور بالخصوص بمبئی کی کانسٹی ٹوانیسی بننے کے بعد متغیر سماجی معاشی تشکیل (Socio-economic Formations) کا مظہر بنا ہوا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد کراچی جب نئی مملکت کا دارالخلافہ بنا تو جیسے پنجاب، سرحد کے تاجر ومزدور وملازمت پیشہ افراد کے لئے میگنٹ(Magnet) بن گیا۔ جہاں تک بارڈر پار سے آنے والوں کا تعلق تھا تو وہ جہاں کہیں سے جہاں بھی آئے کشاں کشاں کراچی پہنچ کر سکونت پذیر ہوگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی اپنی ارضی شناخت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں اگر ان کی کوئی شناخت تشکیل پاتی تھی تو وہ نظریاتی (Ideological) حوالے سے۔اپنے لئے جداگانہ وطن کے حصول کے لئے انہوں نے جو تصورات متحدہ ہندوستان میں قائم کیے انہی تصورات کے خمیر سے ان کی شناخت تشکیل پائی۔"لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان"،"پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" جیسے نعروں کی بازگشت ان کے کانوں میں اب بھی گونج رہی تھی۔ سندھ کے قوم پرست طبقات کو چھوڑ کر کراچی کے کم وبیش تمام نو باشندگاں یا تو لیگی بن گئے یا پین اسلامی۔ البتہ ترقی پسند افراد، خواہ وہ بارڈر کے اس پار سے آئے ہوں یا سرزمین پاکستان کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں عالمی بنیادوں پر مزدور ایکتا کے داعی تھے اور سمجھتے تھے کہ بورژوا جمہوریت کے عمل سے گزرے بغیر پرولتاری آمریت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں۔

سوویت یونین کی سلامتی ان کے لئے مقدم تھی۔ ان کے نزدیک دوسرے حصوں میں انقلاب کی تمام راہیں سوویت یونین سے ہوکر گزرتی تھیں۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے ترقی پسند تمام تر معروضیت پسندی کے باوجود اپنے عمل(Practice) میں ایک طرح سے عینی(Subjective) تھے تو شاید یہ غلط نہ

ہو۔حال جب کہ کسی جامد صورت کا نام نہ ہو، حرکی حالت کا نام ہوتو ''شان حال'' کیوں کر جامد ہوسکتی ہے؟ ''ماضی کی ترجمانی'' ہو کہ ''مستقبل کی نوید'' اس کا ظہور کہیں اور سے نہیں ہوتا، حال ہی سے نمود پذیر ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے کامریڈ ماضی کو خبردار اور مستقبل کو نوید تصور کرتے تھے۔ لیکن جو جارہا جب تک چلا نہ جائے اور جو آرہا ہے جب تک آنہ جائے امکانی یا غالب طور پر ''ہے'' یا ''نہیں'' (Possibly is/is not, probably is/is not) رہتا ہے۔ ''بادلوں سے اٹے ہوئے آسمان اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی زمین پر بجلی کی چمک میں چند قدم چلنے اور اندھیرا چھاتے ہی رک جانے'' والی کیفیت حال میں کسی فرد یا گروہ کا فہم کیوں کر عین الیقین ہوسکتا ہے۔

انداز ہوبہو تری آوازِ پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

ایسی حالت میں کمیونسٹ پارٹی محض بات کی حد تک اپنے برتاؤ میں بقول خویش ''دشمنوں کے لئے مگرمچھ کی پیٹھ کی طرح سخت اور دوستوں کے لئے اپنے پیٹ کی طرح نرم'' ہوسکتی ہے۔ عملی طور پر نہیں۔ عملی طور پر پیٹ کی طرف سے بھی کرخت (Harsh) ہونا اس کی ضرورت ہے۔ پارٹی کا رکن بننے والے ماں کے پیٹ سے کمیونسٹ پیدا نہیں ہوتے۔ پیدا ہونے کے بعد سماج میں رواج پانے والے کلیات ونظریات اور ان سے بڑھ کر سماجی تغیرات کے مشاہدے (Perception) سے اپنے شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں خواہ راہبر ہوں کہ راہ رو ہو شک کے دائرے سے کیوں کر باہر رہ سکتے ہیں۔ دعوے کی حد تک ''ہزاروں پھولوں کے کھلنے، نوع بہ نوع مکاتب فکر کے ٹکرانے کی کھلی اجازت''، یہاں تک کہ پارٹی کے اندر رہتے ہوئے اختلاف رائے کی بھی چھوٹ قول کی حد تک درست رہتی ہے مگر عملاً ممکن نہیں ہوپاتی۔ یادش بخیر پنڈی کانسپی ریسی کے ناکردہ گناہ پر کمیونسٹ پارٹی پر ''قوت

قاہرہ'' نے جو قہر توڑا (حضرت مولانا مودودی بھی ریاست کو خواہ اس کی کوئی شکل ہو آلۂ جبر (Instrument of Coersion) تصور کرتے ہیں) پارٹی کی مرکزی قیادت نے پارٹی تحلیل کردی۔ سندھ کی صوبائی کمیٹی نے اس فیصلے کو مسترد کرکے کامریڈ حسن ناصر کی قیادت میں انڈر گراؤنڈ ہوکر صوبہ سندھ میں پارٹی کو فعال رکھا۔ زمانے نے جب کروٹ بدلی تو یہ سندھ کی صوبائی کمیٹی تھی جس نے کل پاکستان سطح پر پنجاب، سرحد و بلوچستان کے کمیونسٹوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور روس وچین کے حوالے سے کمیونسٹ پارٹیاں تشکیل پذیر ہونے لگیں۔ نازش امروہوی کی قیادت میں متشکل ہونے والی پارٹی نے ون یونٹ خاتمہ اور سابقہ صوبوں کی بحالی کے کم سے کم پروگرام کی بنیاد پر نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) تشکیل دیا اور کل پاکستان سطح پر فعال ہوگئی۔ یہ واقعہ جواب میں بتانے جارہاہوں اسی کمیونسٹ پارٹی کا ہے۔ پارٹی کی ایک میٹنگ میں Veteran کامریڈ کرنل لطیف افغانی جو پنڈی کی صوبائی کمیٹی کے ''رکن'' تھے۔ مرکزی کمیٹی کے ایک نمائندے (غالباً ڈاکٹر اعزاز نذیر) سے کسی بات پر اُلجھ گئے۔ بحث کے دوران کرنل پر انکشاف ہوا کہ پارٹی کے اندر ابھی ان کی پوزیشن کینڈی ڈیٹ ممبر سے زیادہ نہیں۔ کرنل موصوف اس انکشاف پر میٹنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے انہیں دل کا دورہ پڑا، لو پارٹی کیا یہ دنیا چھوڑ گئے۔ حسن سلوک جب یہ ہو تو مجھ جیسا پدی کس اعتماد کے ساتھ لاہور کمیٹی کا کینڈی ڈیٹ ممبر تو دور کی بات ہے پارٹی کا ایک معمولی رکن ہونے پر بغلیں بجا سکتا ہے؟

پارٹی کا اصول کار ''مرکزی جمہوریت'' سہی مگر جب کوئی رائے اکثریتی رائے بن جائے تو دیر یا سویر کلیہ (paradigm) کی حد سے تجاوز کرکے قانون (law) حکم کی صورت اختیار کرہی لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثریتی رائے قلیتی رائے رکھنے والے چپکے چپکے اقلیتی رائے رکھنے والوں کو اقلیتی گروپ تصور کرنے کے بجائے

منحرفین (Devients) تصور کرنے لگتے ہیں۔ پارٹی میں شکوک وشبہات، لعن وطعن کا ایک ایسا بازار گرم ہوجاتا ہے جس سے برگشتہ ہوکر حساس ذہن رکھنے والے بھاگ جاتے ہیں جیسے مہر حسین شاہ۔ اور جن کی تمام تر کشتیاں جل چکی ہوں وہ چار وناچار اس وقت تک ساتھ چلتے رہتے ہیں جب تک ان کے اعصاب ٹوٹ نہیں جاتے، جیسے جام ساقی۔

شاہد حسین کو سب سے پہلے میں نے ایک مجلس مباحثہ میں دیکھا جو تھیوسوفیکل ہال میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس مباحثہ میں مسرور حسین ایک جانب سے تقریر کرکے اسٹیج سے اترے اور دوسری جانب سے زولیخا واحد نے تقریر کرنے کے لئے ڈائس سنبھالا تھا۔ تقریر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ چھریرے بدن کا ایک چھوکرا جس کے بال گھنگریالے تھے، رنگ گورا اور آنکھیں چمک دار، مین گیٹ سے ہال میں داخل ہوا۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھے بہت سے شرکاء اس کی طرف بڑھے اور اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔ شاہد حسین کو دیکھ کر میرا پہلا احساس یہ تھا کہ یہ لڑکا سیمابی کیفیت کا مالک ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے چند شرکاء کو مباحثہ چھوڑ کر اس کے ہمراہ باہر جانے پر اکسایا ہے۔

شاہد حسین سے میری دوسری ملاقات ہفت روزہ ''الفتح'' کے دفتر میں ہوئی۔ وہاں وہ اپنا ایک مضمون شائع کرانے دفتر آئے تھے۔ اگرچہ ''الفتح'' کے مدیر برادرم ارشاد راؤ تھے لیکن بابا (شوکت صدیقی کو سب ''بابا'' کہہ کر پکارتے تھے) کی موجودگی میں راؤ کرسی ادارت پر کبھی نہ بیٹھتے۔ ''بابا'' کی موجودگی میں نہ صرف یہ کہ ادارت کی کرسی ''بابا'' کے نگیں ہوتی بلکہ وہ جس مضمون کی اشاعت کا فیصلہ کرتے وہ پرچہ کی پالیسی کے مطابق ہو یا برخلاف کسی اور کا قلم لگے بغیر شامل اشاعت ہوجاتا۔

شاہد حسین اس زمانے میں Soviet Press Information

Department میں ملازم تھے۔ہفت روزہ ''الفتح'' ایک چین نواز رسالہ تھا۔ لیکن شاہد اپنا ایک مضمون لے کر الفتح کے دفتر ''آیا'' سبک ناک والے چھوکرے نے خطرناک والے بابا کی آنکھوں میں ''دیکھا'' اور انہیں بے خطر بنا کر چلا گیا۔ دوسرے روز شاہد حسین کا مضمون الفتح کی کور اسٹوری بن گیا۔

ہم ان دنوں لاہور سے بھاگ کر کراچی آئے تھے اور الفتح کے دفتر میں مقیم تھے۔ کھانے پینے کا بار راؤ کی جیب پر تھا۔ شوکت بھائی مجھے دونام سے پکارتے۔ کبھی ''چھکن'' کہتے تو کبھی ''ترمیم پسند'' کے لقب سے نوازتے۔ راؤ اور ہم اگرچہ ہم خیال نہ تھے، لیکن وہ جو کسی شاعر کا ایک مصرع ہے،'' چلے بھی آؤ کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں''، راؤ کا گویا مزاج تھا۔ راؤ ہی کا دباؤ تھا جس کے تحت شوکت بھائی نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ترجمان رسالہ ''ہم قلم'' کو فعال بنایا۔ جناب جمیل الدین عالی اس کے مدیر تھے۔ پرچہ طویل عرصہ سے ایک ڈمی کے طور پر شائع ہورہا تھا تاکہ اس کا ڈکلئیریشن منسوخی سے بچا رہے۔ بھلا ہو راؤ کا کہ اس رسالہ کی subbing ہمارے ہاتھ لگی۔ چند ماہ کے لیت ولعل کے بعد مبلغ ۲۰۰ روپے ماہانہ پگار اور گلڈ کے دفتر میں رہائش بھی مل گئی۔ اور ہم چچا غالب کے اس مصرعے کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے'' بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا'' گلڈ کا دفتر ہر اتوار کو ترقی پسند طلباء وطالبات کی بیٹھک بن جاتا۔ شبر اعظمی، نجم الحسن عطا، لالہ رائے انصاری، لندن سے پڑھ کر لوٹنے والے چند ٹراٹسکیا ئیٹس، شیما کرمانی، زینت انیس اور کبھی کبھار شاہد، سلطان احمد اور بابر ایاز بھی آجایا کرتے۔

شاہد حسین ''آنکھیں'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مضمون یا ''کہانی'' میں لکھتے ہیں ''بچوں کی آنکھیں بڑوں کے مقابلے میں زیادہ شفاف، گہری، معصوم اور سوچتی ہوئی کیوں ہوتی ہیں؟ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں ان کی گہرائی ناپنے سے کیوں

قاصر رہتے ہیں؟'' شاہد حسین کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ''بالکل اسی طرح جیسے کہ ''آج'' گزشتہ ''کل'' سے زیادہ بڑا ہوتا ہے، اس سے آگے ہوتا ہے، زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے۔ نیا جنم گزشتہ زمانے میں آنکھ کھولنے والوں سے ہمیشہ زیادہ سمجھ دار، خوبصورت، توانہ، جرات مند، معصوم، نیک اور بلند ہوتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں یا 60 x 60 x 85400 لمحوں میں سے ہرلمحہ، کائنات، فطرت، اور سماجی تاریخ حرکت کررہی ہے یا آگے کی جانب محوسفر ہے۔ لہٰذا سادہ سی بات ہے کہ اس عظیم الشان حرکت کے درمیان آنکھ کھولنے والا ہر بچہ اپنے ساتھ نیاپن لے کر آتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے کہ ہمارا بچہ ہم سے 30 برس چھوٹا ہے تو درحقیقت یہ بیان ایک فکری مغالطہ ہے جسے اتنی مرتبہ اور اتنے تواتر سے دہرایا گیا ہے کہ ہم صاف جھوٹ کو سچ کہتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو یکسر فراموش کردیتے ہیں کہ اس بچہ نے ہم سے 30 برس بعد جنم لیا ہے، یعنی وہ ہم سے 30 برس آگے اور ہم اس سے 30 برس پیچھے ہیں۔ ہم اس کا ماضی ہیں اور ماضی حال سے آگے اور اس سے بڑا کیونکر ہوسکتا ہے؟''

شاہد حسین کے بقول وہ 1968ء میں پارٹی فولڈ میں آئے۔ شاہد کا سال پیدائش 1950ء ہے۔ گویا شاہد جس وقت پارٹی فولڈ میں داخل ہوئے اس وقت 17 یا 18 برس کے رہے ہوں گے۔ یعنی چودھواں برس جو بلوغت کی عمر کہلاتی ہے اس سے تین یا چار برس آگے۔ یہ تو وہ عمر ہے جس عمر میں شعور ایک رو (Stream) کی مانند نہیں سیلابی ریلے (Current) کی طرح توڑتا پھوڑتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خاص طور سے شاہد جیسے نوجوان جو ''دریا میں فنا ہوجانے کو عشرت قطرح'' تصور نہیں کرتے، ''قطرے میں دجلہ دیکھتے ہیں'' ان کے لئے کسی دائرے میں سمٹ کر جینا گویا شاہ دولہ کے چوہے کی شکل اختیار کرنا ہے۔

شاہد حسین نے اپنے ایک مضمون میں فراق صاحب کا ایک شعر نقل کیا ہے:

جاگتا خواب بزم میں دیکھا
ہمیں چراغ ہمیں پروانے

فراق صاحب کا یہ شعر مکمل طور پر شاہد حسین کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

شعور کی ایک تعریف یہ بھی ہے، "Ego made Tangible"۔ شعور کی ایک اور تعریف یہ بھی ہے، "An annoying time between two naps"

شاہد حسین کی آنکھیں دیکھ کر یوں خیال گزرتا ہے جیسے شعور کی متذکرہ دونوں ہی حالتیں اس میں جمع ہیں۔ ہمیں شک ہے کہ خوابوں سے خالی نیند (Dreamless Sleep) شاہد حسین کے نصیب میں نہیں ہے:

میں ایسے شخص کو کس طرح سے انسان کہوں
جو سوچتا بھی نہیں، خواب دیکھتا بھی نہیں

ایک ایسا شخص جو ''بچپن سے جاگتے خواب دیکھنے کا عادی ہو'' وہ کس طرح کسی خول میں بند ہوکر سوچنے کا عادی بن سکتا ہے؟ اس پر مستزاد یہ کہ معمولی سے معمولی آزاد خیالی اور آزادہ روی پر لوگوں کو لعن طعن، طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا جائے، انہیں ہر پل مشکوک نگاہی کا سامنا کرنا پڑے! ایسی فضا میں ہوا کی طرح آزاد منش کتنی دیر حبس دم میں جی سکتا ہے؟

ہوا سنکنے لگی! مجھے جینا چاہیے''

ملارمے (ترجمہ حسن عسکری)

راقم کو ''مفت لے لو خواب'' کے سلسلہ میں کچھ اور مشکلات کا بھی سامنا ہے۔ اول یہ کہ تمام کے تمام متون میری نگاہ میں نہیں۔ ابھی بہت کچھ پائپ لائن میں ہے۔ دوم یہ کہ انہیں مجموعی طور پر ادب کی کس مروجہ زمرے میں رکھا جائے؟

افسانے کی صنف میں یا مضمون کی صنف میں؟ جب کہ ابتدائی تحریریں، مثلاً ''آنکھیں''، ''رات''، ''چوہے''، ''تنہائی''، ''دھوپ''، ''سانپ''، ''ناک'' وغیرہ افسانوی انداز رکھتی ہیں، باقی ماندہ تحریریں، جیسے ''تخبت ہمیں سونے نہیں دیتیں''، ''آپ جائیں گے نہیں''، ''سوئی میں ناکہ''، ''ہمارے فوجی''، ''زمانۂ طالب علمی''، ''ابا جی''، ''۱۹۹۰ کراچی''، ''روانگی''، ''جوتا''، ''حسن پویا''، ''سب ایڈیٹر''، ''دوا''، ''پہلی نوکری''، ''سگریٹ'' وغیرہ کو یادداشت (Memoirs) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پہلی کو لوکا (Lukacs) کی وضع کردہ اصطلاح ''افسانوی حقیقت نگاری'' (Novelistic Realism) تو دوسری کو ''تنقیدی حقیقت نگاری'' (Critical Realism) تصور کیا جائے تو زیادہ مناسب لگتا ہے۔ لیکن ان اصطلاحوں کے توسط سے کسی روائتی صنف کی تشکیل نہیں ہوتی۔ تنقیدی حقیقت نگاری کا نمونہ تو آپ نے اوپر دیکھ لیا۔ افسانوی حقیقت نگاری کا ایک اور نمونہ نیچے دیکھیے:

''ذہن کہتا ہے تم نے آستین میں سانپ پالے ہوئے ہیں جو کئی بار ڈس چکے ہیں، لیکن ان سے بچنے کے بجائے تم انہیں دودھ پلا رہے ہو۔ خوف نہیں آتا؟ دل سے پوچھو تو کہتا ہے کہ پروا نہیں۔ اب رگوں میں زہر دوڑتا ہے۔ یہ کاٹیں گے تو نشہ دو آتشہ ہوجائے گا اور یہ خود زمین پر گر پڑیں گے۔''

یہاں پہ رک کر ہمیں نوجوان شاعر سرفراز ابد کا ایک شعر یاد آتا ہے:

وہ میرا دوست ہے میں اس کا دوست ہوں لیکن
عجیب فرق ہے دونوں کی آستینوں میں

عباس رضوی

شاہد حسین، نویں جماعت میں

شاہد حسین (بھوپال)

والد سیّد محمد وصی (مرحوم) کی گود میں (بھوپال)
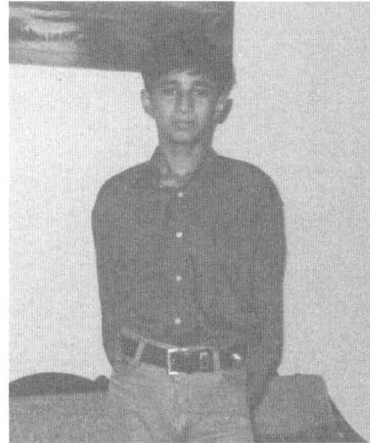
بیٹا سیّد محمد طٰہٰ علی

بیٹی ڈاکٹر زویا حسین

نسرین مایوں کے وقت
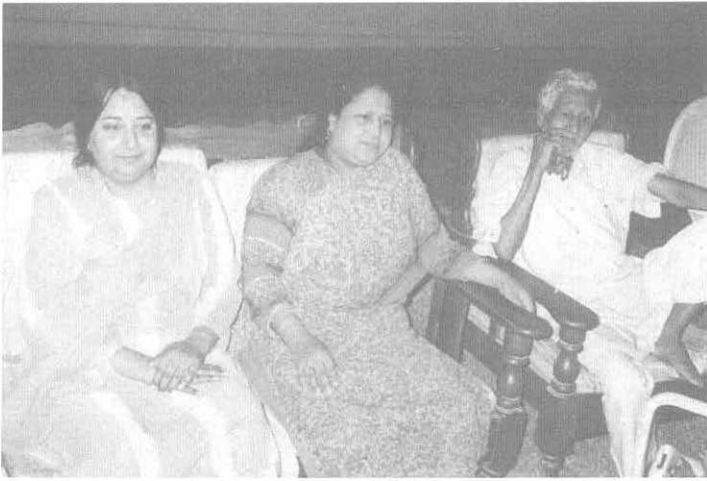
نسرین

دائیں جانب سے سیّد کرم حسین، نسرین اور سالی پروین

چھوٹی بیٹی علیزہ حسین
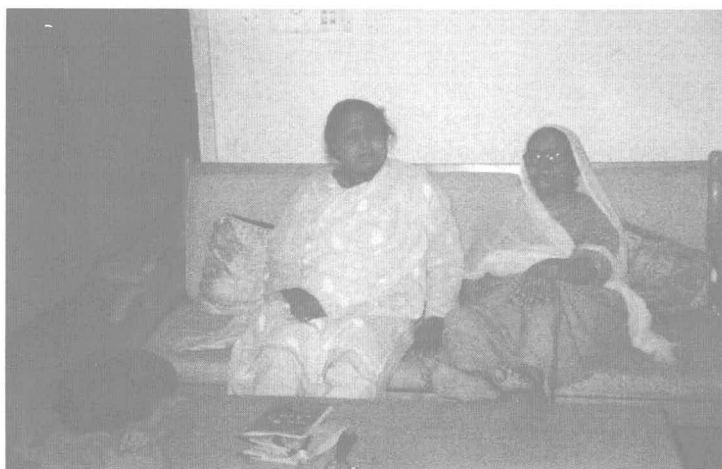
والدہ زبیدہ خاتون اور نسرین

بیٹی ڈاکٹر زویا حسین اور نواسی مریم

نواسی مریم، اٹھارہ ماہ کی عمر میں

مریم

مریم
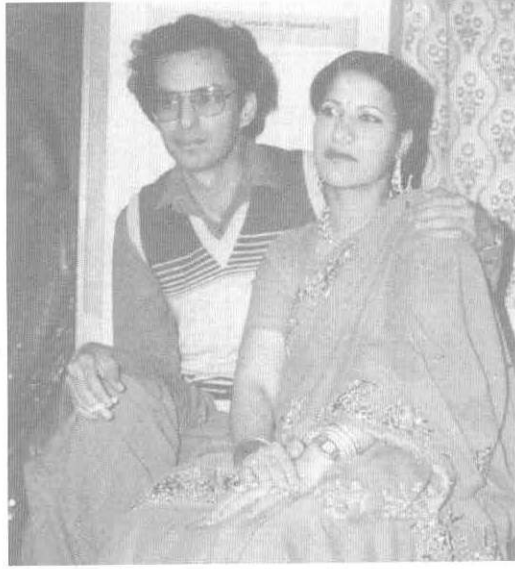
چھوٹی بہن حاجرہ خاتون کے ساتھ

شادی کے موقع پر ڈاکٹر ظفر عارف اور پروفیسر ظفر رضوی

شاہد حسین، شادی کی تصویر، ۱۹۸۳ء
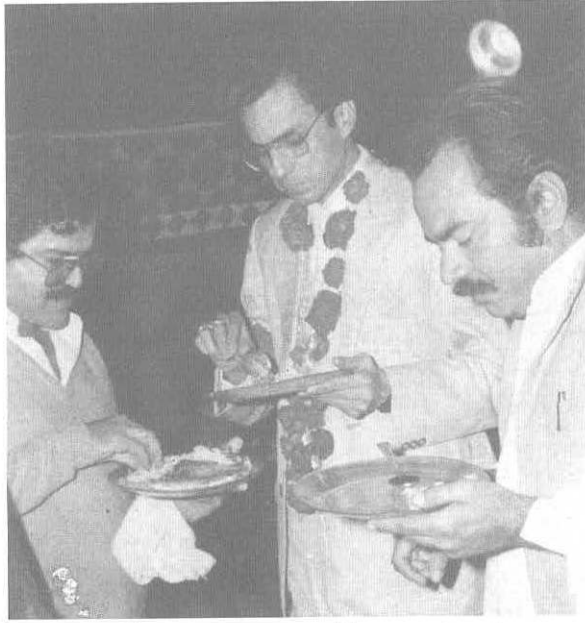
ممتاز صحافی عابد علی سیّد اور شبرا عظمی کے ساتھ ولیمے کے موقع پر، ۱۹۸۳ء
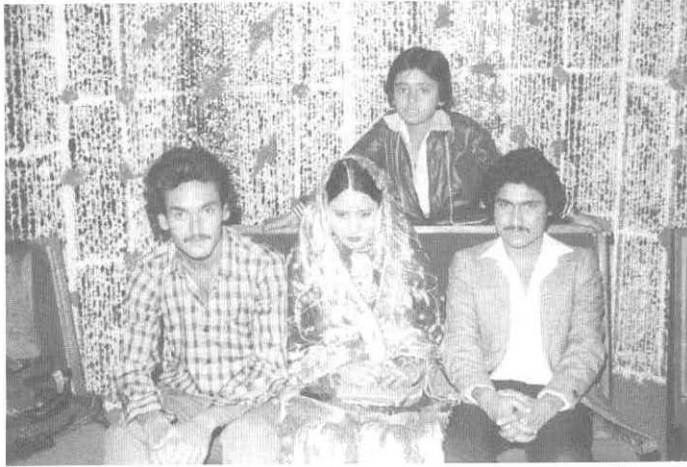
بائیں جانب سے بیٹھے ہوئے، چھوٹا بھائی طاہر حسین، نسرین اور چھوٹا سالہ
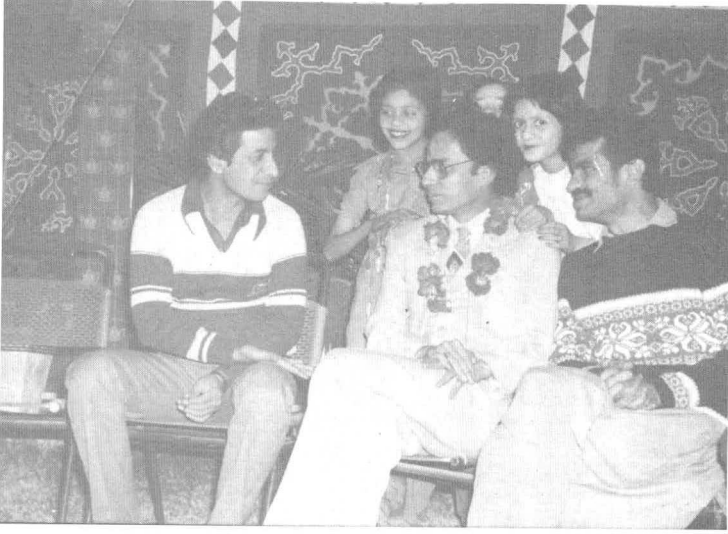
شادی کے موقع پر، دائیں سے گاجیاں بلوچ، شاہد حسین، مجید بلوچ

دائیں سے سینئر صحافی اشرف خان، ''فنانشل پوسٹ'' کے ایڈیٹر اسد رضوی اور شاہد حسین

شادی کے موقع پر، دائیں رشید اختر، مجاہد بریلوی اور شاہد حسین
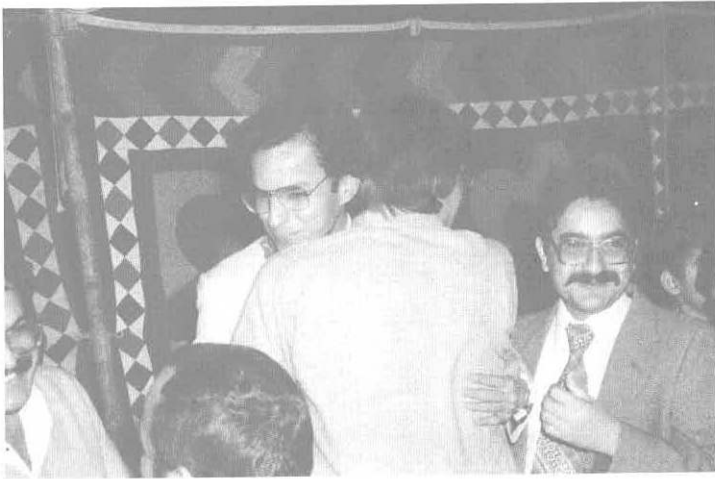
شادی کے موقع پر، دائیں جانب محسن جاوید، جب کہ یونس خان گلے مل رہے ہیں

شاہد حسین، تھرپارکر، ۱۹۸۷ء

پانی و بجلی کے وزیر گوہر ایوب کا انٹرویو لیتے ہوئے، درمیان میں
''فنانشل پوسٹ'' کی ایڈیٹر قدسیہ خان بیٹھی ہیں

یاسمین شیخ میموریل ایمرجنسی میڈیکل سینٹر کی افتتاحی تقریب کے موقع پر،
درمیان میں کینیڈا کے ڈپٹی ہائی کمشنر موجود ہیں

گارجین کے نمائندے پال براؤن کے ساتھ جنرل معین الدین حیدر اور
ڈیلی نیوز کے ایڈیٹر ایس ایم فضل بھی ساتھ ہیں۔

سیّد سبطِ حسن کی گلشنِ اقبال کی رہائش گاہ پر، شاہد حسین، سیّد سبطِ حسن، دانش (نواسی)
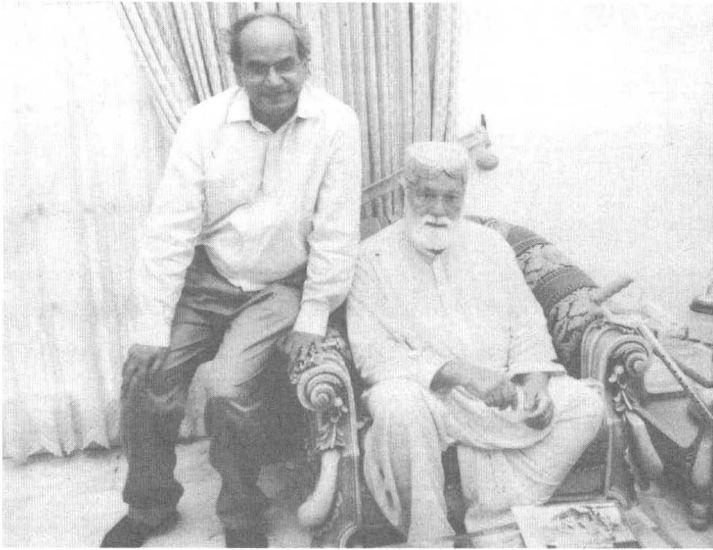
نواب خیر بخش مری کے ساتھ اُن کی کراچی کی رہائش گاہ پر

روزنامہ ''گارجین'' کی جنوبی ایشیا کی سربراہ سوزن گولڈن برگ کے ساتھ، کراچی ۱۹۹۹ء

۱۹۹۷ء میں کراچی میں ماحولیات کی ورکشاپ کے موقع پر، دائیں جانب سے روزنامہ ''گارجین'' کے لندن کے نامہ نگار پال براؤن سے مصافحہ کرتے ہوئے، پال براؤن کی برابر میں جنرل (ر) معین الدین حیدر اور روزنامہ ''دی نیوز'' کے ایڈیٹر ایس ایم فضل بھی موجود ہیں۔

آئی بی اے کے سٹی کیمپس میں، ماحولیات کی ورک شاپ میں،
اگلی صف میں ممتاز صحافی ہمدان امجد علی

کراچی پریس کلب میں جنرل (ر) مرزا اسلم بیگ کا انٹرویو لیتے ہوئے

کیٹی بندر کی ایک تصویر

سندھ کلب میں ڈاکٹر بلینوف (Blinov) کی الوداعی پارٹی، ۱۹۷۴ء، دائیں سے مسز عنایت کاشمیری، عنایت کاشمیری، شاہد حسین، ڈاکٹر بلینوف، انور احسن صدیقی، ریحانہ (مسز انور احسن صدیقی)

شب سُست موج کا ساحل

شاہد حسین کی تحریریں پڑھ کر نہ جانے کیوں مجھے قدیم یونانی دیو مالا کا ایک کردار سسی فس (Ssyphus) یاد آیا جسے سزا دینے کے لئے خداؤں نے اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ وہ ایک بھاری چٹان کو پہاڑ کی بلندی تک دھکیلتا لے جاتا، اور پھر آہستہ آہستہ لڑھکاتا ہوا نیچے لے آتا۔ اور پھر یہی عمل دہراتا رہتا۔ لیکن پہاڑ سے نیچے واپسی کے سفر میں سسی فس اپنے وجود اور اپنی سزا پر سوچتا، غور کرتا ہوا واپس آتا ہے۔ فرانسیسی ادیب البرٹ کامو (Albert Camus) نے اسے پوری انسانیت کے لئے ایک استعارہ قرار دیا ہے۔ شاہد حسین بھی دیو مالا کے اس کردار کی طرح سے زندگی کے جبر، معاشرے کی سختیوں، اپنی ذات اور جسم کی بغاوتوں اور ناآسودگیوں سے بھرپور مدافعت کرتا، لڑتا جھگڑتا، جسم و جان کے بھاری پتھر کو دھکیلتا کسی کوہ ندا کی بلندی تک لے جاتا ہے۔ اور پھر واپسی کے سفر میں دم لیتا ہوا، سوچتا ہوا، اپنے زخموں کو ٹٹولتا ہوا، اپنی ذات اور معاشرے کے بارے میں سوال کرتا جاتا ہے۔ کبھی اسے جواب ملتے ہیں۔ اور کبھی نہیں بھی ملتے۔ وہ پوری ایمانداری، پوری سچائی کے ساتھ اپنی ذات اور اس پر گزرنے والے واقعات کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ بڑا سخت جان آدمی ہے۔ ورنہ بقول میرؔ کے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے

کب کسی ناتواں سے اٹھتا ہے

شاہد حسین جستجو کے اس سفر پر اپنے اسکول اور کالج کے زمانے سے گامزن

ہیں۔وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے نہ صرف خواب دیکھتے بلکہ ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی ہمت بھی کی۔یہ اور بات کہ داستان کہتے کہتے،وہ خود بھی داستان کا ایک کردار بن گئے۔معاشی اور معاشرتی انصاف کا خواب،سچائی،حسن اور خوبصورتی کی سربلندی کا خواب۔اس خواب دیکھنے کی پاداش میں انہوں نے اذیتیں بھی سہی ہیں۔اور مایوسی اور ڈپریشن کے اتھاہ پانیوں میں بھی ڈوبے ہیں۔لیکن پھر اسی عزم اور ولولے کے ساتھ سطح پر واپس ابھرے بھی ہیں۔اپنے تجسس،اپنی وابستگیوں اور تمام تر سچائیوں کے ساتھ۔

ہم اپنے ایک دلِ ناتواں کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

یہ مضامین،جو ایک طرح ان کی سوانح ہیں،ایوبی آمریت کے آخری دور سے شروع ہوتے ہوئے،یحییٰ خان کے دور،سقوط مشرقی پاکستان،بھٹو دور اور اسکے بعد کی روداد ہیں۔اس کے اوّلین حصے میں وہ خود ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں،اور اس لحاظ سے یہ مضامین اس دور کی بائیں بازو کی سیاست کی ایک بڑی قریب سے دیکھی ہوئی،محسوس کی ہوئی،روداد ہیں۔صرف سیاست ہی نہیں بلکہ ان شخصیتوں کی بھی جو کبھی زیرِ زمین اور کبھی بر روئے زمین،سیاسی اور ادبی محاذوں پر سرگرم تھیں۔مضامین کے دوسرے حصے میں یہ سیاسی تحریک ختم ہوگئی یا اتنی ماند پڑ گئی یا شاہد خود اس سے اس حد تک دور ہو گئے کہ وہ اب انکی توجہ کا مرکز نہیں رہتی۔اس دور میں شاہد حسین غم روزگار کا بھی شکار ہیں۔اور صحافی کے طور پر اپنی حیثیت منوانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔وہ کراچی سے تھرپارکر کے صحرا تک،اور کبھی افغانستان تو کبھی امریکہ میں اپنے جذبے اور تحیر کے ساتھ سرگرداں ہیں جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے جاتے ہیں،اور اس کے دوست اور چاہنے والے دعا گو ہیں کہ اسی طرح کرتے رہیں۔ایک

سچے ادیب کی طرح،ہمیں ہماری انسانیت سے ہمکنار کرتے رہیں،ورنہ کشاکش حیات میں ہم جیسے لوگ بھول ہی جاتے ہیں کہ لمحہ موجود سے آگے اور پیچھے،واقعات کا اک تسلسل ہے جو ہماری شناخت بھی ہے ،ہمارا جواز بھی ہے۔تاریخ کے روبرو ہمارا دفاع بھی۔

خورشید حسنین

قائداعظم یونیورسٹی،اسلام آباد

تبصرہ - بے مقصد سے خیالات

''عابد! میری کتاب مکمل ہوگئی ہے۔ آج میں اسے ڈاکٹر ہارون کو دوں گا، کل تمہیں دکھاؤں گا''۔ شاہد حسین اپنی بھاری بھرائی ہوئی آواز میں ہمیں بتا رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہمیں اپنی ایک ہائی پوتھیس یا مفروضے کے بارے میں بتا چکے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم ان کے فلسفے کو بالکل ہی نہیں سمجھ پائے تھے۔ پھر بھی ان کے اصرار پر کم اور دل رکھنے کے لئے زیادہ، یہ کہہ دیا تھا کہ آپ کے فلسفے کی چند باتیں تو ہماری سمجھ میں آسکی ہیں البتہ بہت سی باتیں ہم سمجھنے سے قاصر ہیں یا ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ انہوں نے بھی شاید ہمارا دل رکھنے کے لیے بتایا تھا کہ ڈاکٹر ہارون اور یاسمین تو ان سے متفق ہیں۔ اور یہ کہ وہ ایک دن ہم تینوں کی ملاقات کروائیں گے۔

بات آئی گئی ہوگئی، ہم بھی مطمئن ہو گئے تھے کہ اب وہ ہم سے اس موضوع پر بات کرنے سے احتراز کرتے تھے یا ہمیں علمی طور سے اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے کہ ہم سے کوئی علمی بات کریں۔ پھر یاسمین (ڈاکٹر کنیز فاطمہ) بھی برونائی چلی گئیں، اور ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ آج ان کے فون سے ہم پھر سمجھے کہ یہ کتاب اسی فلسفے کا پرتو ہوگی۔ سہم سے گئے کہ اب ہم کیا کہیں گے۔ دوسرے ہی دن پھر ان کا فون آیا کہ ہارون تو بعد میں دیکھیں گے، آج میں تمہیں کتاب دے جاؤں گا دیکھ لینا۔ اور وہ وقت مقررہ سے پہلے ہی آ کر مسودہ دے گئے کہ اسمبلی کے اجلاس میں جانا تھا۔

ہم نے کتاب کے صفحے پلٹنے شروع کئے تو ہر صفحے پر شاہد حسین ہی نظر آئے، وہی سادگی، معصومیت اور اُلجھے ہوئے خیالات۔ زندگی کی تلخ نوائیاں، دوستوں سے شکایتیں، دہایوں پر محیط تجربے کی بنیاد پر بڑے جید سرخوں کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار۔ مگر یہی تو شاہد حسین ہے، سادہ، دنیا کو اپنی سادگی سے پرکھنے کی کوشش کرنے والا تنہا شاہد حسین۔

پمفلٹ کیس نے اس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا اور ایک عرصۂ دراز تک اسے طبی امداد پر انحصار کرنا پڑا۔ اپنے پیچھے آنے والا ہر شخص اسے سی آئی ڈی کا ہرکارہ لگتا تھا۔ صحت یابی ہوئی تو سوویت محکمہ اطلاعات میں ازراہِ کرم ملازمت دی گئی تھی۔ لیکن ذہن میں گزشتہ دور کی تلخی موجود ہونے کے باوجود شاہد حسین نے اپنی علمی تجربے کو جاری رکھا۔

شاہد حسین نے اس کتاب میں کچھ چھپایا نہیں ہے۔ وہ نویں جماعت میں ہونے والا عشق ہو یا اپنی کم مائیگیوں کا احساس، اس نے انقلابیوں کے نظریاتی کھوکلے پن اور دوغلے کردار پر اپنے نظریات کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ شاہد حسین تو معصوم شخص ہے وہ تو رات میں حسن تلاش کرتا ہے اور آنکھوں میں خواب، ناک اونچی رکھنا چاہتا ہے۔ مگر اب وہ اتنا بیوقوف بھی نہیں کہ آستین میں چھپے سانپوں کو بھی نہ محسوس کر سکے۔ سو محتاط رہئے اسے اپنے ساتھ ہونے والے بھلے بُرے کی تمیز ہو چکی ہے۔ وہ اچھے اور بُرے، سچے اور منافق کو جان سکتا ہے اور ان کی نشاندہی بھی کرنا جانتا ہے۔

عابد

آنکھیں

آنکھیں ہوں، اجالا ہو، ادراک ہو اور گوہرِ مقصود ڈھونڈنے کا جذبہ تو محنت عموماً رائیگاں نہیں جاتی۔ البتہ آنکھیں کمزور ہو جائیں یا حسیات میں کمی واقع ہو جائے یا آدمی عجلت کا مظاہرہ کرے تو پہاڑ بھی گویا اوجھل ہو جاتا ہے۔

آنکھیں بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں ان کی پہنچ لامحدود ہے۔ شرط یہ ہے کہ انہماک اور توجہ سے دیکھنے کی فرصت ملے یا اس کی آرزو دل میں انگڑائیاں لے۔ خواہ فطرت ہو یا مرد وزن کا حسن، دیدہ بینا نہ ہو تو دیکھنے اور نہ دیکھنے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ فطرت اور زندگی کا سارا رنگ و بو عدم وجود بن جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ آنکھیں ایسی حقیقت ہیں کہ سارا زمانہ انہیں شوق سے دیکھتا ہے، ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، ان کی زبان سے آشنا ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر آنکھیں بہت کچھ چھپا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ فلاں شخص کی جھیل جیسی گہری اور شفاف آنکھیں ہیں، کوئی پتھرائی ہوئی آنکھ کے نیلے پتھر کو ایک لمحے کے لئے چھو لیتا ہے اور کوئی اپنی بنجر آنکھوں کو آئینے میں دیکھ کر لرز اٹھتا ہے۔ لیکن کیا ہم واقعی آنکھوں میں جھانک سکتے ہیں؟

جھیل جیسی گہری اور شفاف آنکھیں دیکھنے کی اولین شرط یہی ہے کہ جھیل اور گہرائی اور شفاف کے معنی معلوم ہوں۔ ان کے بارے میں تصور واضح ہو اور دیکھنے والا واقعتاً جھیل اور اس کی گہرائی ناپ چکا ہو اور موازنہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

کیا آنکھوں کی بدلتی ہوئی کیفیت بیان کرنا ممکن ہے؟ قہر آلود آنکھیں، نفرت

اور کینہ سے بھری آنکھیں،مہربان آنکھیں ،شفیق آنکھیں،محبت سے سرشار دمکتی آنکھیں،بھیگی آنکھیں ،شوخی کی پھلجھڑی چھوڑتی ہوئی شریر آنکھیں اور بے چارگی میں ملبوس حماقت زدہ آنکھیں ،سفاک آنکھیں اور قاتل آنکھیں،بے چین اور پرسکون آنکھیں۔غرض کہ جتنے موسم ہیں اور جتنی تبدیلیاں یا اس کے امکانات ہیں، اتنی ہی تبدیلیوں کا رنگ یہ آنکھیں بکھیرتی ہیں اور دیکھنے والے کو حیران اور ششدر کردیتی ہیں۔

ہر آنکھ کا خواب بھی مختلف ہوتا ہے اور یہی خواب درحقیقت شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔جس کا جیسا خواب اور جتنا بڑا خواب اس کی اتنی ہی خوبصورت آنکھیں۔ اس کے اتنے ہی رنگ اور موسم اور اتنا ہی حسن اور حرکت کرنے کی صلاحیت۔

آنکھیں خواب دیکھتی ہیں اور خواب کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔یہ نام نہاد حقیقت سے زیادہ گہرے ،سچے اور جرات مند ہوتے ہیں۔نام نہاد حقیقتیں پردہ پوشی کرتی ہیں اور نقاب اوڑھے رہتی ہیں۔

بچوں کی آنکھیں بڑوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت،شفاف ،گہری، معصوم اور سوچتی ہوئی کیوں ہوتی ہیں؟ہم کتنی بھی کوشش کرلیں ان کی گہرائی ناپنے سے قاصر رہتے ہیں۔اس کا سبب بالکل واضح ہے۔بالکل اسی طرح جیسے کہ ''آج'' گزشتہ ''کل'' سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔اس سے آگے ہوتا ہے زیادہ تجربہ کار اور گہرا ہوتا ہے۔نیا جنم گزشتہ زمانے میں آنکھ کھولنے والوں سے ہمیشہ زیادہ سمجھدار ،خوبصورت ،توانا، جرات مند،معصوم ،نیک اور بلند و بالا ہوتا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں یا 85400 مساوی 24x60x60 لمحوں میں سے ہر لمحہ،کائنات،فطرت اور سماجی تاریخ حرکت کررہی ہے یا آگے کی جانب محوسفر ہے۔لہٰذا سادہ سی بات ہے کہ اس عظیم الشان حرکت کے درمیان آنکھ کھولنے والا ہر بچہ اپنے ساتھ نیا پن لے کر آتا ہے۔مثلاً جب کہا جائے کہ ہمارا بچہ

ہم سے 30 برس چھوٹا ہے تو درحقیقت یہ بیان ایک فکری مغالطہ ہے جسے اتنی مرتبہ اور اتنے تواتر سے دہرایا گیا ہے کہ ہم اس صاف جھوٹ کو سچ سمجھنے لگے ہیں۔

ہم اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں کہ اس بچے نے ہم سے 30 برس بعد جنم لیا ہے، یعنی وہ ہم سے 30 برس آگے اور ہم اس سے 30 برس پیچھے ہیں۔ ہم اس کا ماضی ہیں اور ماضی حال سے آگے اور اس سے بڑا بھلا کیونکر ہوسکتا ہے؟

کیا ہم نے بچوں کو کبھی اس انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اگر نہیں تو قصور سراسر ہمارا اور ہماری آنکھوں کا ہے جو بہت کم دیکھنے کی عادی ہیں لیکن اس کے باوجود جھوٹے تکبر اور ''بڑائی'' سے بھری رہتی ہیں۔

(فروری ۱۹۸۶ء، کراچی)

رات

''رات کیسی خوبصورت حقیقت ہے۔اس کا بدن کتنا ہموار،شفاف اور دمکتا ہوا ہے لیکن ہمارے اطراف میں جو رات طلوع ہوتی ہے اس کا چہرہ شہر کے دھوئیں ،گندگی اور شور نے کتنا مسخ کر دیا ہے۔سانس لینا دوبھر ہے۔تمہیں بھی گھٹن محسوس ہوتی ہے؟''

''اور جب رات کے مکمل جسم پر چاند اور تارے اگ آتے ہیں تو اس کی جانب دیکھنا کتنا خوابناک ہوتا ہے۔یہ ہم خواب دیکھتے ہیں یا حقیقت؟''

''تم نے کبھی چاند توجہ اور شوق سے دیکھا ہے؟''

''ہاں۔چاند کس نے نہیں دیکھا؟''

''یہ مت کہو!''

''اچھا تو تم نے چاند شوق سے دیکھا ہے؟''

ہاں بچپن میں تو بہت دیکھا ،پھر لڑکپن میں جی بھر کر دیکھا'' پھر گویا بینائی چھن گئی۔''

''بینائی چھن گئی؟''

''ہاں بینائی کا چھن جانا بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ہم دیکھنا نہ چاہیں تو ہماری بینائی چھن جاتی ہے!''

(فروری ۱۹۸۶ء، کراچی)

چوہے

صاف لگتا ہے کہ چوہوں کی ایک بہت بڑی بلکہ عظیم الشان دوڑ جاری ہے۔ان گنت چوہے اپنی بھوک مٹانے یا خوف یا نامعلوم طاقت ،جسے خوف کی انتہائی طاقت بھی کہا جاسکتا ہے،کے شدید دباؤ کی وجہ سے دوڑ رہے ہیں۔چونکہ راہداری نسبتاً چھوٹی ہے اور چوہوں کی تعداد اُمڈی چلی آرہی ہے لہٰذا ایک دوسرے کو پھلانگتے، روندتے اور راہ میں حائل رکاوٹوں کو پرے ہٹاتے اور کترتے اور ممکن ہوا تو زخمی کرتے چوہوں کا یہ قافلہ رواں دواں ہے۔

ان کے سفر کی ابتدا بلوں سے ہوئی ہے۔یہ بات تقریباً یقینی یہ لیکن جس جگہ وہ جارہے ہیں وہاں خاصا اندھیرا ہے۔اجالے اور اندھیرے کی ملی جلی لکیر ہے جو بڑھتے ہوئے مکمل اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھوگئی ہے وہی ان کے سفر کی سمت ہے۔واضح نہیں ہو پاتا کہ درحقیقت وہاں گندم سے بھرا کوئی گودام ہے جو پیٹ کی آگ ٹھنڈی کردے گا یا بہت بڑی کھائی ہے جس میں گرجانے کے بعد انہیں اپنے بلوں کو تنگ و تاریک اور نجس ماحول سے نجات مل جائے گی یا سکون اور چھاؤں ہے جہاں زمین کو جھلسا دینے والی تپش سے چھٹکارا مل جائے گا۔

جس مقام سے یہ دوڑ دیکھی جارہی ہے وہاں سے اس جانب کی حقیقت ذرا بھی واضح نہیں ہو پاتی۔یہ بھی ممکن ہے کہ بہت بڑا فریب ہو جس کی کشش اور سحر اس قافلے کو اس سمت لئے جاتا ہے۔

(۱۴رجنوری۱۹۸۶ء)

تنہائی

''دیکھو سایہ کیسے حرکت کرتا ہے۔''

''سایہ حرکت تھوڑی کرتا ہے۔حرکت تو ہم کرتے ہیں ،سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔سایہ ہماری نقل ہے۔''

''سایہ نقل ہے؟''

''سایہ ہماری نقل ہے''

''کیا سایہ ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے؟''

''ہاں سایہ ہمیشہ ساتھ ساتھ بھی رہتا ہے۔''

''یہ جان کیوں نہیں چھوڑتا؟''

''جب ہم جان چھوڑ دیتے ہیں تو یہ بھی جان چھوڑ دیتا ہے۔''

''سایہ سے فرار ممکن نہیں؟''

''سایہ سے فرار ممکن نہیں۔''

''یہ میں ہوں یا میرا سایہ؟''

''یہ تم ہو اور یہ تمہارا سایہ''

''سایہ ایک حقیقت ہے؟''

''حقیقت کا پرتو ہے۔''

''سایہ کتنا تنہا ہے؟''

''نہیں تو۔ ہر وقت تو تمہارے ساتھ رہتا ہے۔''

"تو گویا آدمی کا رفیق تنہائی اس کا سایہ ہے؟"

"ہاں آدمی کا رفیق اس کا سایہ یہ۔لیکن آدمی تو تنہا نہیں۔"

"تنہا نہیں ہے؟"

"سایہ جو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔"

"لیکن سایہ کی بھلا کیا حقیقت ہے؟"

"لیکن آدمی تو حقیقت ہے۔"

"ہاں ۔یہ تو ہے۔"

"پھر تنہائی کیسی؟"

"صرف سایہ ساتھ ہوتا ہے نا۔"

"بہت سی چیزیں ساتھ ساتھ ہو سکتی ہیں۔"

"مثلاً ؟ مجھے تو محسوس نہیں ہوتا"

"تم محسوس جو نہیں کرتے ۔"

"ورنہ؟"

"دیکھو ہوا کیسی اچھی چل رہی ہے۔محسوس ہوئی ؟ دیکھو چڑیا چہچہا رہی ہیں۔ تم ان کی آواز سن رہے ہو؟"

(۲۲ر فروری ۱۹۸۶ء، کراچی)

دھوپ

کیسی عجیب بات ہے ! دھوپ میں چیزیں سوکھ جاتی ہیں اور دھوپ میں پگھل بھی جاتی ہیں یا حدت سے پگھلتی ہیں؟

''ایسے کریں۔''

''کیسے؟''

''ایسے!''

''کر تو لیا۔''

''نہیں ایسے۔''

''ارے تمہاری پینٹی کھسک گئی ہے۔اور گیلی بھی ہوگئی ہے اسے اتار دو۔''

''نہیں۔''

''ارے اتار دو۔دیکھو گیلی ہو رہی ہے۔''

''میں شلوار پہنوں گی۔''

''ہاں پہن لو۔یا پھر ایسے ہی رہو۔دیکھو دھوپ کتنی اچھی ہے۔''

''نہیں شلوار پہنوں گی۔''

''اچھا شلوار پہن لو۔ارے شلوار گیلی ہے۔اسے سوکھنے دو۔ایسے مت پہننا۔''

''نہیں پہنوں گی۔گیلی نہیں ہے۔''

''اچھا پہن لو۔''

"کیسی عجیب بات ہے۔دھوپ میں چیزیں سوکھ جاتی ہیں اور دھوپ میں پگھل بھی جاتی ہیں یا حدت سے پگھلتی ہیں؟دھوپ کتنی گہری ہے اس کا سمندر کتنا سنہری،سرخ اور گلابی ہے!"

(کراچی،۱۹۸۶ء)

سانپ

ذہن کہتا ہے تم نے آستین میں سانپ پالے ہوئے ہیں جو کئی بار ڈس چکے ہیں، لیکن ان سے بچنے کے بجائے تم انہیں دودھ پلا رہے ہو۔
خوف نہیں آتا؟ دل سے پوچھو تو کہتا ہے کوئی پروا نہیں۔ اب رگوں میں زہر دوڑتا ہے۔ یہ کاٹیں گے تو نشہ دوآتشہ ہو جائے گا اور یہ خود زمین پر گر پڑیں گے۔

(۳/ جولائی ۱۹۸۸ء)

ناک

غالباً سب ہی جانتے ہیں کہ ناک ہمارے جسم اور شخصیت کا بڑا اہم حصہ ہے۔چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بردکھوے اور انٹرویو کے وقت سب سے پہلے ناک کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اگر ناک ٹھیک ٹھاک نکل آئی تو پاس ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ہاں اگر انٹرویو کرنے والا ہی اڑ جائے اور اپنی ناک کا مسئلہ بنالے تو دوسری بات ہے۔

ناک کی اقسام بھی درجنوں ہیں۔مثلاً خطرناک،حیرت ناک،عبرت ناک وغیرہ،یہ نتیجہ اخذ رکرنا شاید غلط ہوگا کہ آدمی اپنی ناک سے پہچانا جاتا ہے جس کی جیسی ناک اس کے ویسے ہی اعمال،گویا انسانی نشوونما کسی حد تک ناک کے گرد گھومتی ہے۔

ناک کے حوالے سے لوگوں کو چار عمومی خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے،ناک والے،ناک کٹوانے والے،ناک کاٹنے والے اور بے ناک والے۔آخر الذکر عصری حالت کے بطن سے پیدا ہوئے اور ہمارے ملک میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔تاریخ یا ماقبل تاریخ میں ان کا ملنا محال ہے،چونکہ اس درجہ بندی پر صنف نازک کو اعتراض ہوسکتا ہے لہٰذا ہم احتیاطاً نصف آبادی کو ناک والی،ناک کٹوانے والی،ناک کاٹنے والی اور بے ناک والی کہہ کر اس کی کرختگی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ غم دوراں کے تھپیڑے یا خوف کا عنصر اتنی شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں کہ ستواں ناک تقریباً غائب ہوجاتی ہے اور اس عمل سے ایک عجیب وغریب ناک جنم لیتی ہے۔ ع ہر چند کہیں کہ ہے،نہیں ہے۔

مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے اپنی کہانی میں صرف ناک کاٹنے والوں کا

ذکر کیا ہے چنانچہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد اور پل کے نیچے اتنا پانی بہہ جانے کے بعد ناک کے مسائل کا از سرنو جائزہ لیا جائے اور مختلف حضرات ایک مکمل ناک کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کریں۔

سب جانتے ہیں کہ ہمارے ادب اور تاریخ میں ناک کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔تاریخ تو گویا ناک سے اٹی پڑی ہے۔ چنانچہ جب کہا جائے کہ فلاں شخص ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا یا غصہ فلاں کی ناک پر دھرا رہتا ہے تو مذکورہ شخصیت کا سراپا ہماری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے اسی طرح جب تلقین کی جائے کہ ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ تو پوچھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔یہ دیگر بات ہے کہ ناک کی سیدھ میں کوئی گڑھا آ جائے تو پچھتاوا ضرور ہوتا ہے اور حضرت بشر کی ناک پر طبع آزمائی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مصوری، مجسمہ سازی اور فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں میں ناک کی اہمیت مسلم ہے۔اکثر فنکاروں کو ان لمحات میں بڑا خوش وخرم دیکھا گیا ہے جب ان کی کسی تخلیق میں ناک نمایاں ہوگئی یا ابھر کر سامنے آ گئی۔جن فنکاروں کو اس مقصد کے حصول میں کامیابی نہ ہو ان کی گویا ناک کٹ جاتی ہے اور وہ منہ چھپائے پھرتے ہیں۔گویا تشخص کے لئے ناک کا ہونا ضروری ہے۔

اس بارے میں قیاس کرنا مشکل ہے کہ معاشرہ ناک کے ساتھ کیا سلوک کرے گا لیکن ہمارے سماج میں یہ واضح ہو گیا ہے کہ خطرناک ہر نوع کی ناک پر بھاری پڑتی ہے۔عالمی سطح پر بھی صورتحال زیادہ مختلف نہیں۔خطرناکوں کا ایک بظاہر چھوٹا سا ٹولہ جب چاہئے چھوٹی موٹی ناک کاٹ کر پھینک سکتا ہے۔

اطراف سے سبھی نتائج اخذ کرتے ہیں۔چنانچہ باکسنگ یا مکہ بازی کے کھیل کو لیجیے۔جیت ہمیشہ خطرناک کی ہوتی ہے۔اور وہ بڑی آسانی سے حریف کی

ناک توڑ دیتی ہے۔انگریزی میں اسی عمل کو ناک آؤٹ کرنا کہتے ہیں۔ماہرین نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ آپریشن کے ذریعے ناک کی ہڈی نکلوادی جائے اس طرح چوٹ بھی کم لگتی ہے اور آزمائش کے مختلف مراحل میں ناک کی شکل وصورت بھی حسب ضرورت بدلتی رہتی ہے۔

چونکہ ہمارے ملک میں جمہوری اور سیاسی عمل ذرا کم ہی ہوا ہے۔لہٰذا بیشتر سیاستدانوں کو ٹی وی کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ ایسی ظالم شے ہے کہ اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔چنانچہ باکسروں کی دیکھا دیکھی ہمارے ان سیاستدانوں نے بھی ناک کی ہڈی نکلوادی۔جو کم حیثیت کے حامل تھے انہوں نے دیسی اسپتالوں میں آپریشن کرایا مگر جن کی اڑان اونچی تھی انہوں نے امریکہ اور انگلستان کے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں اور خوش وخرم واپس آئے۔اب وہ بڑے اطمینان سے سیاست کررہے ہیں۔سکون گویا ان کی ناک پر بیٹھا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ تاریخی ناک کی اپنی اہمیت ہے مثلاً جنرل ڈیگال، ہٹلر،مسولینی اور مارشل اسٹالن کی ناک سے بچہ بچہ واقف ہے۔خیال رہے کہ بعض اوقات ناک غضب کا دھوکہ دیتی ہے۔مثلاً جنگ عظیم میں روسیوں کی ٹھٹھری ہوئی ٹھنڈی ناک نے ہٹلر کی آریائی ناک کو ناکوں چنے چبوادیئے۔اگر بچوں کو ناک کے حوالے سے تاریخ پڑھائی جائے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گی اور دلچسپی بھی ہوگی یعنی ایک پنتھ دو کاج کے مصداق تاریخ کی تاریخ اور ناک کی ناک!

مغرب کے نامور مورخین نے ہندی اور سندھی ناک کی بڑی تعریف کی ہے۔وہ یہ اعتراف کرنے میں قطعاً شرمندہ نہیں ہیں کہ ہندوستانی ناک ،تاریخی اعتبار سے سب سے اونچی ہے۔مثلاً میکس ملر(Max Muller) جیسا جید مورخ ہماری ناک کا معترف ہے اور اپنی ناک کی جڑیں ہماری ناک میں ڈھونڈتا ہے اور پھولا نہیں

سماتا۔ پھر ہم کیوں پشیمان ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ خطرناک کے خوف نے ہمیں ناک چھپانے پر مجبور کر دیا ہے؟ ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماضی کے حملہ آوروں نے متعدد بار ہماری ناک پر نشانات چھوڑے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے اور مارے کھسیاہٹ کے ہم ساری بستی کی ناک کاٹنے کے درپے ہیں۔

اب تک ہم یہ سنتے آئے ہیں کہ زن، زر اور زمین سارے فساد کی جڑ ہیں۔ جدید تحقیق نے اس مفروضہ کی تردید کر دی ہے اور دلائل کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ فساد کی اصل جڑ ناک ہے۔ اختصار کے خیال سے یہاں صرف دو ایک مثالیں دینا کافی ہوں گی۔ ایک جگہ ہڑتال ہوئی۔ نوجوانوں نے اور ان لوگوں نے جن کے دل جوان تھے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقریریں کیں، نعرے لگائے، اشتہار بانٹے، غبارے اڑائے اور غل مچایا۔ سرکار بڑی پریشان ہوئی۔ چنانچہ گفت وشنید اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ بزرگوں کے ایک گروپ کا چناؤ ہوا اور اسے سرکار سے مذاکرات کا کام سونپا گیا۔ کئی روز تک بند دروازوں کے پیچھے گفت وشنید ہوتی رہی اور جب وہ اختتام پذیر ہوئی اور مذاکرات میں حصہ لینے والے بزرگ باہر آئے تو سب کی ناک کٹی ہوئی تھی۔ یہ منظر نوجوانوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان کا اشتعال بڑی حد تک منطقی تھا کیونکہ انہیں اپنے بزرگوں سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ جب ایک بدتمیز نوجوان نے اپنے بزرگ کا گریبان تھاما اور ناک کٹوانے کا سبب پوچھا تو وہ روہانسو ہو گئے۔ اشک آلود آنکھوں اور لکنت بھری آواز میں صرف اتنا کہا کہ زبردستی ہوئی ہے۔ لیکن زبردستی کیونکر ہوسکتی ہے؟ آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ ناک زبردستی نہیں کاٹی جاسکتی۔ دونوں فریقین کی مرضی شامل ہونا ضروری ہے؟ بزرگوار نے رومال سے کٹی ہوئی ناک چھپائی اور مخمل قدموں سے آگے بڑھ گئے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ سننے میں آیا۔ شہر میں چرچا تھا کہ ''ہندو پاک

ناک کانفرنس' ہونے والی ہے۔ ہندوستان پاکستان کی تمام اہم ناکوں کو مدعو کیا جارہا تھا۔لیکن جیسا کہ انسانی فطرت ہے۔ بعض حضرات اس موقع پر بھی اعتراضات کرنے سے باز نہیں آئے۔ایک صاحب معترض ہوئے کہ جناب چنچل ناک پوری ،اور دختر ملیح آبادی کو مدعو کیا نہیں کیا جارہا ہے۔ آخر دونوں حضرات اچھی خاصی خوبصورت ناک والے ہیں اور ہماری ادبی تاریخ میں ان کی ناک کی بڑی اہمیت بھی ہے۔اس اعتراض کا اولین جواب ایک نوجوان نے ناک پونچھتے ہوئے دیا کہ یہ دونوں حضرات بہت خودسر اور مغرور ہیں اور اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتے۔ ہر چھوٹی ناک کا تمسخر اڑاتے ہیں۔کبھی ہمارے جلسوں میں شامل نہیں ہوتے۔ جواب معقول تھا لیکن یہ حضرت پھر بھی باز نہیں آئے اور پچاس برس قبل ہونے والی ''کل ہندناک کانفرنس'' کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس میں تو کوہ ہمالیہ جیسی ناک اور موہان اور گورکھ پور کی ممتاز ناکوں کے علاوہ شانتی نکیتن کی خوبصورت اور سبک ناک سے بھی آشیر باد لی گئی تھی اب ایسی کون سی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے ناک کانفرنس میں وہ لوگ شامل ہورہے ہیں جو سرعام ناک کٹوا چکے ہیں؟اس سوال پر حضرت بے ناک امرہوی کو سخت غصہ آ گیا اور وہ آستین چڑھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔پھر کچھ سوچ کر غسل خانے کی سمت چلے گئے۔البتہ آریائی ناک والے ایک خوبرو نے اپنی عینک کو چھوتے ہوئے زیرلب صرف ایک لفظ کہا''احساس کمتری!''اور آنکھیں بند کرلیں یہ اشارہ کافی تھا۔نشست برخاست ہوگئی۔مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ تمام مسائل کی جڑ ناک ہے۔ ہر طرح کی تعمیر اور تخریب اور حرکت وتوازن میں ناک بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ناک صحیح و سالم رکھنے کی کوششیں ہوتی رہنی چاہئے۔باقی اللہ مالک ہے کہ غلبہ خطرناک کا ہونا ہے یا سوچتی ہوئی ناک کا......

(۱۹۸۶ء، کراچی)

زمانۂ طالب علمی

مجھے یاد نہیں کس سن میں میرا گرین وُڈ سیکنڈری اسکول (Greenwood Secondary School) میں داخلہ ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ اسکول بہت ہرا بھرا تھا۔ اسکول میں بہت سے پیڑ تھے۔ اور موتیا کے سینکڑوں پودے تھے۔ اسکول کے گیٹ کے پاس ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ تھا اور قریب ہی کینٹین تھی۔ سنا تھا کہ قیام پاکستان سے قبل یہ کسی ہندو کا باغ ہوا کرتا تھا۔ ہماری پرنسپل مسز قزلباش نے جو اسکول کی مالکن بھی تھیں۔ کلاسیں اس طرح بنوائی تھیں کہ باغ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ موتیے کے پھول اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ ایک گل فروش روزانہ ایک ٹوکری بھر کے پھول لے جاتا۔ طرح طرح کی چڑیاں ان پودوں پر آ کر بیٹھتیں اور ہم کلاس روم میں بیٹھے انہیں دیکھتے تھے۔ اسکول میں میوزک کی کلاسیں بھی ہوتی تھیں اور ہمارے ایک اسپورٹس ٹیچر بھی ہوا کرتے تھے۔ با قاعدہ اسمبلی ہوتی تھی اور کوئی نہ کوئی طالب علم اخبار کی سرخیاں اسمبلی میں پڑھ کر سناتا تھا۔

مجھے سب سے پہلی محبت اپنی ٹیچر مس قدسیہ سے ہوئی۔ یہ تیسری جماعت (Prep) کی بات ہے مس قدسیہ غالباً کشمیری تھیں اور مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میں مس کہتا تھا تو جواب میں کہتیں ''کیا ہے مس کے لتے'' مجھے لفظ ''لتے'' کے معنی معلوم نہیں تھے۔ بہت بعد میں میں نے ایک پنجابی دوست سے پوچھا کہ ''لتے'' کے معنی کیا ہیں تو اس نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے ''مس کے چہیتے۔''

مس قدسیہ ہم بچوں کو اپنے گھر بھی لے جاتیں جو جیکب لائنز (Jacob Lines) کے ایک کشادہ کوارٹر میں واقع تھا۔ بندو خان کے پیچھے۔ وہ ہمیں اپنے گھر پر میوزیکل چیرز(Musical Chairs) کا کھیل کھلواتیں اور مزے مزے کی چیزیں کھلاتیں۔ ان کا ایک بھانجا تھا۔ ہم سے چھوٹا۔اس کا نام انعام تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوجاتا۔بہت چھوٹا تھا۔ اس سے پوچھو?What's your name تو کہتا"I name is Inam"اس کی غلطی پر ہم نسبتاً بڑے بچے ہنستے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ جب میں نویں جماعت میں آیا تو مجھے ایک چھٹی جماعت کی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں اور شفاف جلد ابھی تک یاد ہے۔ وہ ہماری صبح کی شفٹ کی ہیڈ میسٹریس کی بیٹی تھی۔ دوپہر کی شفٹ کی ہیڈ مسٹریس مسز منصور تھیں جو ہمیں Maths پڑھاتی تھیں۔ بہت سادے سے کپڑے پہنتی تھیں اور مجھے بلیک بورڈ پر بلا کر Theorem حل کرنے کو دیتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ مجھ سے کبھی غلطی ہوئی ہو۔ میں نصابی کتاب سے ہٹ کر بھی Theorem حل کر لیتا تھا۔

دوسرا شوق مجھے کہانیاں پڑھنے کا تھا۔ گھر میں بہت اچھی کتابیں موجود تھیں۔ مجاز، منٹو، جوش، جگر، جاںنثار اختر وغیرہ کی کتابیں۔ امی بتاتیں کہ جاںنثار اختر کی بڑی بہن صفیہ آپا بھوپال میں ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے میرے ماموں سید اسلام حسین کو پڑھایا بھی تھا۔

ہمارے دونوں ماموں بھی بہت شوق سے کتابیں پڑھتے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ محلے میں ایک لائبریری بھی تھی۔ جہاں ایک آنے روز کے حساب سے کتاب کرایہ پر مل جاتی تھی۔ وہاں سے میں روز کوئی نہ کوئی کتاب لے آتا۔ جس میں ابن صفی کے ناول بھی ہوتے اور ادبی کتابیں بھی۔ روز ایک ناول پڑھ ڈالتا۔

ہمارے اسکول میں آسان اردو پڑھائی جاتی تھی کیونکہ یہ انگریزی اسکول تھا۔ دوسرے لڑکوں کی نسبت میری اردو بہت اچھی تھی۔ کیونکہ میں گھر پر ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔ کرشن چندر، بیدی وغیرہ کو میں نے اسکول میں ہی پڑھ لیا تھا۔ نویں جماعت میں میں نے اسکول میگزین میں ایک کہانی بھی لکھی ''جب میرا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔'' یہ ایک ایسے لڑکے کی کہانی تھی جو خیالوں میں کھو جاتا تھا۔

جب میں دسویں کا امتحان دے چکا تو ہماری Farewell Party ہوئی اور مجھے "Leader of the opposition" کا خطاب ملا۔

اس کی شاید ایک وجہ تھی۔ ہماری ہیڈ مسٹریس مسز منصور جو ہمیں Maths پڑھاتی تھیں اسکول چھوڑ کر لندن چلی گئی تھیں اور ایک دوسری ہیڈ مسٹریس مسز K.P.Chando ان کی جگہ آ گئی تھیں جن سے میں چڑتا تھا۔ وہ بنگالن تھیں اور انہوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا تھا۔ بڑی سخت تھیں اور روز نہ بذات خود دیکھتیں کہ لڑکوں نے جرابیں (Socks) پہنی ہوئی ہیں یا نہیں۔ میں جان بوجھ کر بغیر جرابوں کے آجاتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ بولیں "I want to see your father" (میں تمہارے والد سے ملنا چاہتی ہوں)۔ میں نے کہا۔ ''وہ شہر سے باہر نوکری کرتے ہیں۔'' بولیں "Then i want to see your guardian" میں نے کہا "He is very busy" کہنے لگیں، "My father is a minister but he has time to meet people" وہ مجھ سے کافی چڑ گئیں۔ انہوں نے میرے دوست جاوید اقبال کے والد کو بلایا اور تاکید کی کہ جاوید مجھ سے نہ ملا کرے۔

جاوید پھر بھی ملتا تھا۔ ہمارا ایک مشغلہ تھا۔ سرکلر ریلوے اسٹیشن (Circular Railway Station) کا چار آنے کا ٹکٹ لے لیتے اور سارا سارا دن کھارادر سے

ڈرگ روڈ تک سیر کرتے۔ اس تفریح کا نام ''آخری اسٹیشن' رکھ دیا تھا۔ انہیں دنوں اسی نام کی فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں فلم اسٹار شبنم نے ایک پگلی کا رول ادا کیا تھا۔ ساری فلم میں شبنم صرف ایک جملہ بولتی تھی ''بابو بیڑی دو!''

Farewell Party کے بعد میں نے اپنے اسکول کے جامن کے پیڑ پر ایک نظم لکھی جو ہمارے دوست سلمان نے رکھ لی۔

نویں جماعت میں ہماری ہیڈ مسٹریس مسز منصور نے چار پانچ گروپس بنا دیئے تھے جو حساب میں کمزور بچوں کو کلاس کے بعد Maths پڑھاتے تھے۔ ان کا ایک گروپ لیڈر ہوتا تھا۔ جس گروپ کا میں لیڈر تھا اس میں صبیحہ اور اختر ہوا کرتے تھے۔

صبیحہ بہت اسمارٹ لڑکی تھی اور کشمیر روڈ پر رہتی تھی۔ اس کی والدہ مسز حمید ہمارے اسکول کی شاید سب سے پرانی ٹیچر تھیں۔

ہماری کلاس کے ایک لڑکے مسعود کو شاید صبیحہ سے محبت ہوگئی تھی لیکن نجانے کیوں وہ مسعود سے چڑتی تھی۔

ایک دن مسعود مجھے اور معین کو اسکول کے سامنے مسجد میں لے گیا اور بولا ''یہاں قسم کھاؤ کہ صبیحہ کا ساری زندگی خیال رکھو گے۔''

میں نے دل میں سوچا اس کا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو صبیحہ Genetics Dept میں ریسرچ کررہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی ''پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔'' غالباً اس کا اشارہ میری سیاسی سرگرمیوں کی طرف تھا ۔ میں نے صرف یہ کہا کہ یونین کے انتخابات میں ووٹ این ایس ایف (NSF) کو دینا۔ کہنے لگی ''ٹھیک ہے۔''

صبیحہ سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً وہ Phd وغیرہ کر کے کہیں باہر

چلی گئی۔

۱۹۶۶ء میں میٹرک کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ مل گیا۔ اس وقت شہر کے دو ہی ممتاز کالج تھے۔ ڈی جے گورنمنٹ سائنس کالج اور آدم جی کالج۔ ڈی جے میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ میرے ماموں اسلام حسین ایک پارسی ڈاکٹر مودی سے ایک سفارشی چٹھی لکھوا کر لائے۔

ڈاکٹر مودی نیشنل بنک کے panel پر تھے اور ڈی جے کالج کے اس وقت کے پرنسپل پروفیسر جے بی سدھوا کے پڑوسی تھے۔ بہت سخت پروفیسر تھے اور ایڈمیشن فارم خود دیتے تھے اگر فارم مل گیا تو سمجھو داخلہ ہوگیا میں ان کے پاس گیا اور ڈاکٹر مودی کی چٹھی دکھائی۔ انہوں نے اسے کچرے کی ٹوکری میں ڈال دی۔

"Show me your marks sheet"(اپنی مارکس شیٹ مجھے دکھاؤ)۔

میرے 59% مارکس آئے تھے لیکن Maths میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوا تھا اور کمیسٹری اور بیالوجی میں بھی بہت اچھے نمبر تھے۔ پروفیسر سدھوا نے فارم دے دیا اور میرا داخلہ ہوگیا۔ میں نے بہت سوچا کہ اردو میں میرے کم نمبر کیوں آئے۔ پھر اندازہ ہوا کہ میں نے ایک حماقت کی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر پر خلاصہ لکھنے کو کہا گیا تھا۔ میں نے محلّہ کی لائبریری سے مولانا محمد علی جوہر کی سوانح حیات پڑھی تھی۔ بجائے خلاصہ لکھنے کے ان پر بہت طویل مضمون لکھ دیا تھا۔ ۲۰ نمبر کٹ گئے تھے۔

ڈی جے کالج میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ میں اپنے چھوٹے ماموں سید احتشام حسین کے ساتھ عزیز آباد میں رہتا تھا۔ کالج گھر سے بہت دور تھا اور ایکسٹرا پیریڈ بہت ہوتے تھے۔ ایک پیریڈ صبح دس بجے تو دوسرا تین بجے۔ یہاں میری دوستی پروفیسر ظفر رضوی سے ہوگئی جو انگریزی پڑھاتے تھے اور شہر کے تقریباً سارے Debators ان کے شاگرد تھے۔ وہ مجھے بھی Debator بنانا چاہتے تھے لیکن میں اسٹیج

پر جانے سے بہت گھبراتا تھا۔ وہ ہمارے گھر بھی آتے اور ہمارے ابا سے خوب باتیں کرتے۔ اتوار کے دن انہیں گھر کا سودا لینا ہوتا تھا۔ وہ نارتھ ناظم آباد سے میرے گھر لیاقت آباد آجاتے اور کہتے چلو سودا لینا ہے۔ مارکیٹ سے چیزیں لیتے، نماز کا وقت ہوجاتا تو راستے میں کسی مسجد میں نماز پڑھ لیتے۔ مجھے راستے میں کچھ کھلا بھی دیتے۔ میں ان کی بھانجی کو بھی پڑھاتا تھا۔

فرسٹ ائیر میں تھا کہ سلمان بھاگا بھاگا سائیکل پر آیا کہنے لگا نجمہ اس کی چھوٹی بہنوں کو ٹیوشن پڑھانے آنے لگی ہے۔ نجمہ، ثمینہ کی سب سے گہری دوست تھی۔ میں عین ٹیوشن کے وقت سلمان کے گھر پہنچ جاتا۔ اس سے باتیں کرتا۔ میں نے اس سے ثمینہ کی ایک تصویر مانگی جو اس نے بھیج دی۔ فرسٹ ائیر کے امتحانات میں میرا سینٹر جہانگیر روڈ کا ایک اسکول تھا۔ کرتا پاجامہ پہن کر وہاں گیا تھا اور ثمینہ کی تصویر جیب میں تھی۔ ایک استاد میرے پاس آئے اور پوچھا آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا بھوپال کے۔ کہنے لگے اچھا بھوپال کے شہزادے ہیں۔ میں کچھ نہیں بولا۔ تھوڑے دنوں بعد نجمہ نے کہا ثمینہ کہہ رہی تھی کہ شاہد میری تصویر کہیں اس کے بڑے بھائی سلیم کو نہ دکھادے جو ڈی جے کالج میں میرے ساتھ تھا۔ مجھے بہت دکھ ہوا اور تصویر پھاڑ کر پھینک دی۔

ثمینہ کی آنکھیں اور شفاف جلد کبھی نہیں بھولا۔

امتحان تو میں نے پاس کرلیا لیکن نمبر کم آئے۔ دوستوں نے کہا Repeat کرو۔ میں نے سراج الدولہ کالج میں داخلہ لے لیا جو گھر سے قریب تھا اور Advance Urdu لے لی تاکہ اپنے ماموں پروفیسر مجتبیٰ حسین سے اردو پڑھوں۔ وہ ملک کے ممتاز نقاد تھے۔

سراج الدولہ کالج سے میں نے این ایس ایف کی سیاست میں حصہ لینا

شروع کیا۔ ادبی سوسائٹی (Literary Society) کا جوائنٹ سیکریڑی بھی منتخب ہوگیا۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور جوش صاحب کے ساتھ کالج میں پروگرام بنایا۔ ہم ایک Wall Magazine بھی نکالتے تھے جس کا سہرا ہلال نقوی (Dr.Hilal Naqvi) کے سر تھا۔ وہ ہماری Literary Society کے صدر تھے۔

شاید 58% نمبر آئے اور میں نے جامعہ کراچی میں B.Sc. Honours فرسٹ ائیر میں داخلہ لے لیا۔ طارق فتح جو ہماری این ایس ایف کے جنرل سیکریڑی تھے مجھ سے سنئیر تھے۔ انہوں نے کہا فزیالوجی ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لے لو۔ اس کی یہ وجہ بتائی کہ نئیر عزیز مسعودی جو اس وقت فزیالوجی ڈپارٹمنٹ میں این ایس ایف کے نمائندے ہوا کرتے تھے، ماسٹرز (Masters) کرکے جاچکے تھے اور ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔

فزیالوجی ڈپارٹمنٹ میں اس وقت ڈاکٹر قاضی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہوا کرتے تھے۔ میرا زیادہ وقت آرٹس لابی میں گزرتا۔ گھر سے روزانہ ایک روپیہ ملتا۔ ۲۰ پیسہ آنے جانے میں لگ جاتے اور چھ آنے میں کھانا مل جاتا۔ میں تقریباً روز ڈاؤ میڈیکل کالج اور لیاری بھی چلا جاتا تھا۔

میں NSF کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا اور انقلاب لانے کی سوچا کرتا۔ جب B.Sc Honours کے پہلے سال میں آیا تو Manzoor Gichki اس زمانے میں بلوچ اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن (BSO) کے کراچی کے سربراہ تھے اور ملک گیر سطح پر این ایس ایف، ایسٹ پاکستان اسٹوڈینٹس یونین (مظفر چوہدری گروپ) بی ایس او اور پختون اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا اتحاد تھا۔ پنجاب میں بھی پنجاب اسٹوڈینٹس یونین کے نام سے ایک چھوٹی سی تنظیم موجود تھی جس کے لیڈر عباس رضوی تھے۔ اور تمام تنظمیں Pakistan Federal Union of Students کے عمومی نام سے کام کررہی تھیں۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے اور نتائج جنرل یحییٰ کی مرضی کے نہیں آئے۔ چنانچہ ایک لڑائی شروع ہوگئی۔

میں Under Ground کمیونسٹ پارٹی میں گروپ ممبر بھی تھا۔ پروفیسر جمال الدین نقوی جو اردو کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے ہمارے گروپ کے انچارج تھے۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی ۱۹۷۱ء میں شروع ہوئی۔ ہماری پارٹی نے بہت سے پمفلٹ اس کے خلاف لگائے۔

ایک دن میں نے گروپ میٹنگ میں تجویز پیش کی کہ شاہ ایران ۲۵۰۰واں سالہ جشن شہنشاہیت منا رہا ہے ہمیں اس کے خلاف ایک پمفلٹ نکالنا چاہیے۔ جمال صاحب بولے: ''تم ہی لکھ ڈالو۔'' میں بڑا خوش ہوا اور ایک پمفلٹ لکھا کہ اسلام میں شہنشاہیت کی گنجائش نہیں ہے۔ سائیکلو اسٹائل ہوکر پمفلٹ سارے ملک میں بٹ گیا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں اپنے گھر میں ریاض مفتون کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ دو تین سادہ لباس والے آئے۔ دروازے کی گھنٹی بجائی کہ تھانے تک چلنا ہے۔ ریاض مفتون یا گھر کے کسی فرد کو بتائے بغیر ان کی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ تھانہ قریب ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔ لیکن ٹیکسی آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئی اور مجھے اوپر کی منزل پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بہت سے لوگ پہلے ہی گرفتار ہوچکے تھے۔ ان میں ڈاکٹر م۔ر۔حسان، شاہد مسیح، عنایت کاشمیری اور ہدایت شامل تھے۔

نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکریٹری محمود الحق عثمانی، جاوید شکور، تنویر اور خٹک پہلے سے جیل میں تھے۔

اس کے علاوہ ائیر فورس کے کچھ لوگ بھی تھے۔ ایک کا نام Lt.Nizam تھا جو بنگالی تھا، دوسرا Subhan جو نواکھلی کا Assistant Commissioner تھا، پھر

ہمارا پیارا دوست انور پیرزادہ بھی تھا۔ یہ لوگ Class-A میں تھے اور ان کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔

ہم اکثر ان لوگوں کے پاس جاتے اور کافی پیتے۔ نواز بٹ اور ڈاکٹر حسان Class.B میں تھے۔ جہاں ناشتہ میں انڈا ملتا تھا۔ میں مزدور رہنما جاوید شکور کے ساتھ ایک کھولی میں تھا۔

جاوید شکور نے مجھ سے کہا کہ وہ اردو پڑھ سکتے ہیں، لکھ نہیں سکتے۔ چنانچہ میں نے انہیں پڑھانا شروع کیا۔ جبران خلیل جبرانؒ کی ایک کتاب میرے پاس تھی۔ میں بولتا جاتا وہ لکھتے۔ پھر میں غلطیاں درست کرتا اور دوبارہ لکھنے کو کہتا۔

ہمارے ایک رفیق کو اس بات پر اعتراض ہوا کہ جبران خلیل سے املا کیوں لکھوایا جارہا ہے۔ ان کی نظر میں جبران خلیل جبران بورژوا تھا۔

میری والدہ روز میرے لیے کھانا اور کچھ پھل لاتیں۔ انہیں دوہری پریشانی تھی۔ میں جیل میں تھا اور میرے والد کی پوسٹنگ تھر پارکر میں تھی جہاں ہندوستانی فوج در آئی تھی۔

ایک دن مجھے اطلاع دی گئی کہ میری والدہ ملنے آئی ہیں۔ میں ماڑی پر چلا گیا۔ ماڑی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں قیدی اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ درمیان میں لوہے کی جالی تھی۔ اس میں سے کھانے پینے کی چیزیں براہ راست نہیں دی جاسکتیں۔ ٹوکری پر قیدی کا نام لکھ دیا جاتا اور وہ جانچ پڑتال کے بعد قیدی کو پہنچا دی جاتی۔

ماڑی پر اس روز جیل کا Superintendent منظور پنہور (Manzoor Panhwar) بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے سے نکل گیا بغیر نظریں نیچے کیے ہوئے۔

وہ تپا بیٹھا تھا کہ یہ کون شخص ہے جو اسے سلام کیئے بغیر سامنے سے گزر گیا۔
ماڑی کے اس طرف میری والدی کھڑی تھیں۔ کچھ پھل وغیرہ لائی تھیں۔ میرے ہاتھ میں خالی ٹوکری تھی جس پر میرے نام کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے وہ پھاڑ کر اپنی والدہ کو دی کہ وہ اس ٹوکری پر لگادیں جو وہ لائی تھیں۔

منظور پنہور(Manzoor Panhwar) چنگھاڑا اور اس نے میری گدی پر ایک ہاتھ مارا۔ وہ غالباً یہ سمجھا کہ میں اپنی والدہ کو کوئی خط دے رہا ہوں۔ جب اس نے میری گدی پر ہاتھ مارا تو اس کے سارے ماتحتوں نے بھی مجھے مارنا شروع کر دیا۔
ماڑی پر ڈاکٹر حسان بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میری والدہ نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ تھرتھر کانپ رہے تھے۔ مجھے ڈنڈا بیری لگا دی گئی اور پنہور نے حکم دیا کہ اسے ''بندوارڈ'' میں لے جاؤ۔ ''بندوارڈ'' جیل میں ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں قیدی کو روزانہ مارا جاتا ہے۔

جیل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عثمانی صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں نے موقف اختیار کیا کہ مجھے ''بندوارڈ'' میں نہیں جانے دیں گے۔
مجھے لانڈھی جیل ٹرانسفر کر دیا گیا جو بچوں کی جیل(Juvenile Jail) تھی۔ ویسے بھی میری عمر 21 سال سے کم تھی اور مجھے اصولاً بچوں کی جیل میں رکھا جانا چاہیے تھا۔

جب میں لانڈھی جیل پہنچا تو وہاں کے سپریٹنڈنٹ نے جو سندھی تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں، بغیر کسی وجہ کے مجھے ایک تھپڑ مارا اور مجھے ایک کھولی میں منتقل کر دیا گیا۔ سخت سردی تھی اور میں فرش پہ لیٹا ہوا تھا بغیر کمبل کے۔ ڈنڈا بیری میرے ٹخنوں کو چھیل رہی تھی۔ رات اذیت میں گزری۔ صبح ہوئی تو ایک لڑکا میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا آپ کو پتہ ہے آپ کہاں رہ رہے ہیں؟ میں نے اس سے

پوچھا "میں کہاں رہ رہا ہوں؟"

اس نے کہا۔ "یہ چرچا وارڈ ہے"

میں کچھ نہیں بولا۔

چند دنوں بعد جب لوگوں نے ہنگامہ کیا تو مجھے ایک دوسری کھولی میں منتقل کر دیا گیا۔

اس اثنا میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہوگئی اور ہندوستان کے بمبار طیارے جیل سے متصل مشین ٹول فیکٹری کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے۔ مجھے ڈر لگتا کہ غلطی سے کوئی بم جیل پر نہ گر جائے۔

سقوط ڈھاکہ ہوگیا اور میری رہائی کا پروانہ آ گیا۔ جب میں رہا کیا جا رہا تھا تو لانڈھی جیل کے سپرینٹنڈنٹ نے مجھے Manzoor Panhwar کا ایک خط دکھایا اور کہا اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ Panhwar نے لکھا تھا کہ یہ پاگل ہے اور اسے "چرچا" وارڈ میں رکھو۔ یہ لوگ اب ڈرے ہوئے تھے۔

ہماری این ایس ایف کے لیڈر ہوتے تھے ڈاکٹر وودو۔ وہ بیرسٹر (Barrister) تھے۔ انہوں نے میرے گھر پر کہلوایا کہ مقدمہ کریں گے لیکن منظور پنہور نے معافی مانگ لی اور کہا کہ "مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ لوگ سید ہیں۔ میں جناب سیدہ کا واسطہ دیتا ہوں آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔" میری والدہ نے معاف کر دیا۔

(Alexendria VA, July 18, 2010)

پہلی نوکری

۱۹۷۲ء میں جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ہم سب لوگ رہا ہوگئے۔ سنا ہے کہ زاہد حسین نے معراج محمد خان سے کہا کہ بھٹو سے سوال کرو کہ پمفلٹ کیس (Pamphlet case) کے لوگ کب رہا ہوں گے اور بھٹو نے ہم لوگوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ ہمارے دوست صدیق بلوچ کچھ اور بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عطاءاللہ مینگل نے بھٹو پر دباؤ ڈالا کہ ہم لوگوں کو رہا کرو۔ مجھے یاد ہے کہ زاہد نے بیرسٹر عزیز نومی کو ہمارے پاس سینٹرل جیل کراچی بھیجا تھا کہ ہمارا کیس لڑیں۔ بیرسٹر نومی ایک انتہائی خوب صورت اور وجیہہ شخص تھے اور غالباً تازہ تازہ لندن سے بیرسٹری کرکے آئے تھے۔ وہ مجھ سے کراچی جیل کی ماڑی پر ملے اور کہا کہ وہ ہمارا مقدمہ لڑنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کوئی بریگیڈیر ان سے پوچھ رہا تھا کہ انہیں اس مقدمہ میں کیوں دلچسپی ہے؟ بیرسٹر نومی نے مجھ سے پوچھا کہ اگر پمفلٹ کی کوئی کاپی ہوتو انہیں دے دی جائے۔ اول تو پمفلٹ کی کوئی کاپی جیل میں تھی نہیں پھر مجھے شبہ ہوا کہ یہ شخص فوج کا آدمی تو نہیں ہے۔ میں نے منع کردیا۔ وہ واپس چلے گئے۔

رہائی کے بعد جب میں گھر پہنچا تو محلے کے وہی لڑکے جو مجھے "غدار" کہتے تھے پھولوں کا ہار لائے۔ ہماری بات سچ ثابت ہوئی اور فوجی آمر جنرل یحییٰ غلط ثابت ہوا تھا۔ ہماری طاقت انتہائی معمولی تھی لیکن ہم نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی گئی تو ملک ٹوٹ جائے گا۔ یہی ہوا۔

رہائی کے فوراً بعد میں نے ایک رجسٹر لیا اور طلباء تحریک کی تاریخ لکھنی

شروع کردی۔ تین دن تک مسلسل جاگتا رہا اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا کہ حواس جواب دے گئے۔ ناک سے پانی بہنے لگا اور اسی کیفیت میں اپنے گھر سے پیدل مجاہد بریلوی کے گھر پہنچ گیا جو رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد سے متصل عثمانیہ سوسائٹی میں تھا۔ مجاہد اپنی بہن کے یہاں گئے ہوئے تھے لیکن ان کی والدہ اور بہنوں نے گھر میں بٹھایا اور Valium کھانے کو دی۔ قریب ہی ہمارا این ایس ایف(NSF) کا دوست مقتدا رہتا تھا۔ وہ رکشہ میں بٹھا کر مجاہد کی بہن جو شاید Queens Road پر رہتی تھیں، کے پاس لے گیا۔ یاد نہیں کہ مجاہد سے وہاں ملاقات ہوئی کہ نہیں۔

بہر حال پتہ چلا کہ میرا Nervous Breakdown ہو گیا ہے۔ ہمارے N.S.F. کے دوست ڈاکٹر الیاس جو ڈاؤ میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کے طالب علم تھے، مجھے ڈاکٹر ہارون احمد کے کلینک لے گئے جو غالباً غفور چیمبرز میں تھا۔ میں انگریزی میں زور زور سے بول رہا تھا۔ ڈاکٹر ہارون اپنے کمرے سے نکلے اور مجھ سے کہا خاموش رہو۔ پتہ نہیں ان کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ میں خاموش ہو گیا۔ مجھے جناح ہسپتال کے Neuropshychiatric Ward میں داخل کرلیا گیا جو 20 نمبر وارڈ کہلاتا تھا۔

وارڈ میں پنکھا نہیں تھا اور مجھے گرمی لگتی تھی۔ میں ڈاکٹر ہارون کے کمرے میں جا کر صوفے پر لیٹ جاتا۔ وہ کمرہ Air conditioned تھا۔ اس میں خوشبو بھی آتی تھی۔ غالباً Air Freshner کی۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتے تھے۔

وہاں ایک مس خان ہوتی تھیں۔ چار پانچ بجے کے قریب ہم سب لوگ مس خان کے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک بنگالی آرٹسٹ تھا۔ وہ تصویریں بناتا اور بہت tense رہتا تھا۔ میں عجیب وغریب کہانیاں لکھتا جن میں انسان چاند پر آباد ہو جاتے تھے۔

ایک دن میں نے اپنے دوست عابد علی سید سے جو یونیورسٹی کے طالب علم

تھے اور The Sun اخبار میں بھی کام کرتے تھے، کہا شہلا کو بلائیں۔ انہوں نے شاید شہلا کو پیغام دیا اور شہلا اور ان کی چھوٹی بہن (ڈاکٹر حمیرا) مجھ سے ملنے اسپتال آئیں۔ وہ میرے لیے کیلے لائی تھیں جو بہت ٹھنڈے تھے۔ مجھے ان کیلوں کی ٹھنڈک اب تک یاد ہے۔

غوث بخش بزنجو نے کہلوایا کہ شاہد کو علاج کے لیے ماسکو بھجواتے ہیں لیکن ڈاکٹر ہارون نے یقین دلا یا کہ چند مہینوں کی بات ہے، شاہد ٹھیک ہوجائے گا۔ میری طبیعت سنبھلی ہی تھی کہ ہمارے والد کو جو محکمہ جنگلا ت میں کام کرتے تھے اور بہت ایماندار اور پڑھے لکھے افسر تھے نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔ گویا ہمارے خاندان کی معاشی طور پر کمر ٹوٹ گئی۔

میں نے نوکری تلاش کرنا شروع کی۔ چند مہینے ایک بینک میں کام کیا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ روسی سفارت خانہ کے محکمہ اطلاعات "Soviet Press & Information Department" میں کوئی آسامی خالی ہوئی ہے۔ ہمارے این ایس ایف کے دوست افسر نقوی معروف دانشور اور مورخ سید سبط حسن کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ میرے لئے ایک سفارشی چٹھی لکھ دیں۔ سبط صاحب پاک سوویت دوستی انجمن کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ صحافت ٹیکنیکل کام ہے لیکن ایک چٹھی لکھ دی اور لفافہ میں بند کر کے مجھے دی اور ہدایت کی کہ اس وقت کے روسی Consul بلینوف (Blinov) سے ملو۔

دوسرے دن میں بلینوف کے پاس گیا اور سفارشی چٹھی دی۔ پڑھ کر بولا "Very strong Recommendation!" پھر کہنے لگا:

"Mr. Husain, this is a place for retired people, you will be in trouble when you leave this place".

میں کچھ نہیں بولا۔ سوچا ابھی تو نوکری چاہیے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔
بلینوف نے مجھ سے کہا کہ اس وقت تو کوئی آسامی نہیں ہے۔ لیکن جوں ہی ہوگی وہ مجھے بلا لے گا۔ میں مایوس ہوکر گھر آ گیا۔ اسی اثنا میں ایک بینک میں نوکری مل گئی لیکن وہاں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ روز دیر سے پہنچنا اور ہمارا انچارج حاضری رجسٹر پر سرخ نشان لگا دیتا۔ ابھی میرا "Probationery Period" چل رہا تھا کہ ہمارے دوست عنایت کاشمیری میرے گھر آئے اور کہا بلینوف نے بلایا ہے۔ میرا سوویت محکمہ اطلاعات میں تقرر ہو گیا۔ چھ سو روپے تنخواہ طے ہوئی۔ بینک میں ۲۲۵ روپے ملتے تھے۔

ایک سیل بنایا گیا جس کا نام "Creative Cell" تھا۔ اس میں ، میں، عنایت کاشمیری اور سندھی کے مایہ ناز افسانہ نگار منیر مانک کام کرتے تھے۔ میں نے ورلڈ مارکسٹ ریویو (World Marxist Review) میں ٹریڈ یونین تحریک پر ایک طویل مضمون پڑھا تھا جو مجھے یاد تھا۔

میرا ٹیسٹ ہوا۔ ٹیسٹ کیا تھا، بس کہہ دیا گیا کوئی مضمون لکھو۔ میں نے عالمی مزدور تحریک پر ایک مضمون لکھ دیا اور اس وقت کے ہفت روزہ ''الفتح'' کے ایڈیٹر شوکت صدیقی کو دے کر آ گیا۔ بس میں گھر جا رہا تھا کہ ہمارے این ایس ایف کے دوست سلطان نقوی نے مجھ سے کہا کہ تمہاری کور اسٹوری (Cover Story) چھپی ہے ''الفتح'' میں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ کور اسٹوری کیا ہوتی ہے۔ خاموش رہا اور ہاکر سے جا کر ''الفتح'' کی ایک کاپی خریدی۔ تب سمجھ میں آیا کہ کور اسٹوری کیا ہوتی ہے۔

دوسرے دن مجھے بلینوف نے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا ''الفتح'' چین نواز پرچہ ہے اور ہم نے بہت کوشش کی کہ وہاں ہمارے مضامین چھپیں لیکن وہ نہیں چھاپتے۔ تم نے کیسے چھپوائی؟ میں نے بتایا کہ میں شوکت صاحب سے واقف بھی نہیں تھا۔ بس ان کو اپنا مضمون دے کر آ گیا اور چھپ گیا۔ میری تنخواہ چھ سو روپے سے آٹھ

سو روپے کردی گئی۔ اور بلینوف مجھ پر بہت مہربان ہوگیا۔ اس کا سوویت یونین کے محکمہ خارجہ سے تعلق تھا اور وہ ماسکو یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات (International Relations) کا پروفیسر رہا تھا۔ اب وہ فارغ اوقات میں مجھے اپنے کمرے میں بلا لیتا اور گپ شپ کرتا۔ مجھے بہت مزا آتا۔ کبھی کبھی ہم "Creative Cell" کے لوگوں کو شام کے وقت بھی بلا لیتا اور ہم گپ شپ کرتے۔ مسلم شمیم جو وہاں منیجر تھے ہمارے ساتھ ہوتے۔

ایک دن ''جنگ و امن'' کے موضوع پر بات چیت چھڑ گئی۔ میں (World Marxist Review) جو عالمی کمیونسٹ تحریک کا نمائندہ ماہنامہ تھا اور پراگ سے شائع ہوتا تھا باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس میں جرمن کمیونسٹ پارٹی کے اس وقت کے چیرمین کا جنگ و امن پر ایک مضمون پڑھا تھا اور اس کا حوالہ دینا شروع کردیا اور بلینوف سے بحث شروع کردی۔

جرمن کمیونسٹ پارٹی کے چیرمین کے بارے میں بلینوف نے کہا۔ (He is an old man) (وہ بوڑھا آدمی ہے) اور بحث ختم ہوگئی۔ ایک دن کہنے لگا: "Stalin made mistakes but he was a true Marxist" (اسٹالن سے غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن وہ سچا مارکس وادی تھا)۔

ایک دفعہ بلینوف نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ مارکسی فلسفہ پر مجھے دو کتابیں دیں اور کہا ہم ان میں سے ایک کتاب اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرانا چاہتے ہیں، پڑھ کر بتاؤ کون سی بہتر رہے گی؟ میں پھولا نہیں سمایا کہ مجھے اتنی اہمیت مل رہی ہے۔ میں نے دونوں کتابیں پڑھیں اور تجویز دی کہ ان میں سے وہ کتاب زیادہ بہتر ہے جو روسی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ''پراودا'' (Pravda) کے ایڈیٹر نے لکھی ہے۔ میری تجویز مان لی گئی اور ''طلوع'' کے ایڈیٹر انوراحسن صدیقی نے اس کتاب کا

بڑی جانفشانی سے ترجمہ کیا اور وہ ''مارکسی فلسفہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ بھی بلینوف کے پڑھانے کا طریقہ تھا۔

بلینوف سے میرا ساتھ بہت کم رہا۔ میں نے جولائی ۱۹۷۳ء میں سوویت محکمہ اطلاعات میں نوکری شروع کی تھی۔ اس کا غالباً ۱۹۷۴ء میں تبادلہ ہوگیا۔ یہ لوگ عام طور سے چار سال کی مدت کے لیے تعینات ہوتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جب وہ واپس جانے لگا تو اس وقت کے سوویت قونصل جنرل وولکوف (Volkov) نے بلینوف کے اعزاز میں سندھ کلب میں دعوت دی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ وولکوف کوئی سوا چھ فٹ کا انتہائی اسمارٹ آدمی تھا۔

بلینوف نے اس سے میرا تعارف کراتے وقت کہا:

"He is my son" (یہ میرا بیٹا ہے)۔

وولکوف نے جھک کر پوچھا "Are you a Student?" (کیا آپ طالب علم ہیں؟)

میں نے جواب دیا: "I am an Editor" (میں ایڈیٹر ہوں)

جب بلینوف کی رخصتی کا آخری دن تھا تو میں نے اسے میاں افتخار الدین کی تقاریر پر مشتمل کتاب تحفتاً پیش کی جو عبداللہ ملک نے شائع کی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں گیا اور میرے لیے "Cufflinks" اور ایک "Electric Shaver" لے کر آیا اور مجھے تحفتاً دیتے ہوئے کہا "These are made up of Russian emerald" (یہ روسی زمرد کی بنی ہوئی ہیں)

وہ Cufflinks کچھ دنوں تو میرے پاس رہیں پھر کہیں گر گئیں۔ لیکن اس کی یادیں اب تک باقی ہیں۔ سنا تھا کہ بلینوف مصر میں سفیر ہوگیا تھا کہ دل کا دورہ پڑا اور مر گیا۔

(۸ رمئی ۲۰۱۰ء)

ہمارے فوجی

1983ء میں میری شادی ہوئی ۔ شادی کے بعد میرے ایک عزیز نے جو پاک فضائیہ میں ائیر کموڈور تھے مجھے کھانے پر بلایا۔ وہ سروس سے ریٹائر ہوگئے تھے لیکن ابھی ائیرفورس کے ماری پوری بیس(Mauripur Base) میں رہتے تھے۔ میں،نسرین اور ہماری امی شام کے وقت ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہماری امی اور کموڈور صاحب کی بیگم کی بہت پرانی دوستی تھی۔

کھانے کے دوران کموڈور صاحب نے مجھ سے پوچھا''اور سیاست کیسی چل رہی ہے؟''

میں نے کہا''میں سیاست نہیں کرتا!''

پھر وہ کہنے لگے۔''میں سوچ رہا ہوں کہ پی آئی اے چلا جاؤں۔''

میں نے کہا''پی آئی اے میں ابھی سینکڑوں لوگوں کی چھانٹیاں ہوئی ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر نکالا گیا ہے کہ ادارہ Over Staffed ہے۔لیکن ظاہر ہے آپ وہاں چلے جائیں گے۔''

کہنے لگے۔''شاہد، سپاہی قوم کے لیے خدمات انجام دیتا ہے۔ اس کے عوض قوم اسے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی پلاٹ یا نوکری دے دیتی ہے۔''

میں نے کہا۔''لیکن آپ لوگوں کی کیا خدمات ہیں؟ ایک 1965ء کی جنگ لڑی تھی۔ اس کے بارے میں بھی اس وقت کے ائیر مارشل اصغر خان نے لکھ دیا ہے

کہ ہار گئے تھے۔ 1971 میں کیا ہوا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

سرخ ہوگئے۔ کہنے لگے "شاہد، میں تو ایم اے کر کے ائیرفورس میں آیا تھا۔ 33 سال نوکری کی ہے۔ ہم ائیرفورس کے لوگ بہت لبرل ہوتے ہیں۔ اگر یہی بات تم کسی فوجی سے کہتے تو بہت برا ہوتا۔"

ان کی بیٹی کہنے لگیں "شاہد بھائی آپ حلوہ کھائیں۔"

ان کی بیگم اپنے شوہر سے مخاطب ہوکر بولیں۔ "تم چپ رہو جی۔ تم لوگ شاہ ایران کے حامی تھے جب شاہد نے شاہ کے خلاف پمفلٹ لکھا تھا۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ میں اس کے بعد ان کے گھر کبھی نہیں گیا لیکن کسی تقریب میں ملاقات ہوتی تو مجھے "سب ایڈیٹر، سب ایڈیٹر" کہہ کر چھیڑتے، مجھے بہت غصہ آتا لیکن چپ رہتا۔ میں رپورٹر تھا۔

1983ء میں میری طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ درحقیقت شادی کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی میں اپنے اسکول کے زمانے کے ایک دوست کے گھر جاکر بیٹھ جاتا۔ اس نے اپنے سسرال والوں سے تعارف کروادیا جو قریب ہی رہتے تھے۔ ان کے یہاں جاکر بیٹھ جاتا۔ اس کی دو عدد سالیاں تھیں۔ جڑواں۔ ایک انتہائی باتونی۔ ایک بہت کم گو۔

میں کرتا دھرتا تو کچھ نہیں۔ اپنے دوست سے قرض لے کر شادی کرلی تھی اور بزنس کی ٹھائی تھی جس کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میرے والد اسٹیل مل کے "Horticultural Department" میں ڈپٹی منیجر تھے اور میں نے ٹھانی تھی کہ ان کی مدد سے پودے اور پھول ایکسپورٹ کروں گا۔ ایک دن میرا پھوپھی زاد بھائی پرانی نمائش کے پاس ایک پیڑ سے شاخیں کاٹ رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور پوچھا یہ کیا کررہے ہو۔ بھائی نے بتایا کہ وہ شاخیں اپنے ماموں کے لیے کاٹ رہا ہے جو پیڑ

پودوں کے ماہر ہیں۔ یہ فوراً ہمارے گھر پہنچ گیا اور بتایا کہ وہ زرعی انجینئر ہے اور سعودی عرب کے شاہی محل میں کام کرتا ہے جہاں لاکھوں پودوں کی ضرورت ہے۔ اس کی بات سن کر میں بہت Excite ہوگیا اور اس کے ساتھ گھومنے لگا۔ یہ شخص طرح طرح کے منصوبے بناتا۔ ایک دن کہنے لگا کہ سعودی عرب کے شاہی محل کا کوئی شہزادہ اسی ملین ڈالر پاکستان ٹرانسفر کرانا چاہتا ہے لیکن BCCI کے ذریعہ کرانا چاہتا ہے۔ میں نے یقین دلا یا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بندوبست کردوں گا۔ BCCI میں میرے ایک دوست اقبال میاں ہوا کرتے تھے۔ ان کے پاس گیا۔ وہ مجھے جنرل منیجر ایم اے بخاری کے پاس لے گئے اور ساری روئیداد بیان کی۔ بخاری صاحب نے عزت سے بٹھایا اور سعودی عرب اس نمبر پر ٹیلکس کیا جو اس شخص نے دیا تھا۔ پتہ چلا کہ Telex نمبر غلط ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سعودی عرب کے کسی شاہی محل کا ٹیلکس نہیں تھا بلکہ کسی معمولی سے ہوٹل کا ٹیلکس تھا۔ خیر بخاری صاحب اس سے فون پر بات کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے متعلقہ کاغذات، اسے Courier کے ذریعہ بھیج دیئے۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ٹیلکس پر اپنے ایک ماموں جو ریٹائرڈ سفیر تھے اور بڑے نمازی پرہیز گار تھے اور اپنے عزیز ائیر کموڈور کے نام بغیر ان کی اجازت کے ریفرنس کے طور پر لکھ دیئے۔ دونوں ہی بڑے معتبر نام تھے۔ ہمیشہ شرمندگی رہی کہ کیوں لکھ دیئے۔

92-1991ء میں جب میری طبیعت پھر سے خراب ہوئی تو میں نے یہ Telex ڈاکٹر ہارون احمد کے پاس جمع کروادیئے یہ سوچ کر کہ وہ BCCI والے دوست کے نام پر ہونے والی بلیک میلنگ (Black Mailing) کا پتہ کروالیں گے۔ انہوں نے تحقیقات کیں تو کچھ اور نام نامہ نکالا کہ ''شاہد پیسہ لے کر کھاجاتا ہے'' جب کہ حقیقت یہ تھی میں نے قرض لیا تھا اور ادائیگی کے لیے میرے پاس پیسہ نہ

تھا۔اب ایک دھن تھی جو ذہن پر سوار ہوگئی۔قرض اتارنے کی دھن۔1983ء کے بعد میں نے قرض کبھی نہیں لیا۔زویا کی شادی کا فریضہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرکے کیا۔

1988ء میں ایک اور فوجی سے ملاقات ہوئی۔کراچی کے Avari Towers میں ایک دفاعی کانفرنس ہورہی تھی۔تین دن کی۔میں اس زمانے میں بزنس ریکارڈر اخبار میں کام کرتا تھا۔ایڈیٹر نے اس کانفرنس کو کور کرنے کا کام مجھے سونپا۔میں سخت بے چین تھا۔دوپہر کو جب کھانے کا وقفہ ہوا تو میں متذکرہ کانفرنس کے صدر کے پاس گیا جن کا ائیرفورس سے تعلق تھااور بولا مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ہال خالی ہوچکا تھا۔انہوں نے وہیں بٹھا لیا۔

میں نے کہا''ائیر وائس مارشل صاحب میرا نچلے متوسط طبقے سے تعلق ہے۔مرغن غذائی کھانے کا کبھی کبھی موقع ملتا ہے لیکن یہ جو آپ کی کانفرنس کے شرکاء ہیں، یہ تو ماشاء اللہ سے بہت بڑے بڑے افسر ہیں۔یہ کھانے پر کیوں ٹوٹ پڑتے ہیں؟''

کہنے لگے''آدم جنت سے گندم کی وجہ سے تو نکالا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔''ایسانہیں ہے۔آپ نے کبھی گندم کا دانہ غور سے دیکھا ہے؟''

ائیر وائس مارشل صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا''اچھا تو آپ ایسا سمجھتے ہیں؟''

پھر میں نے کہا جناب مجھے لگتا ہے جنرل ضیاء کو مار دیا جائے گا۔کچھ بولے نہیں۔شام کے وقت جب کانفرنس ختم ہوئی تو مجھ سے کہا آپ میرے ساتھ آیئے۔وہ وہیں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔اپنے کمرے میں لے گئے۔وہاں منسٹری آف ڈیفنس کے ایک جوائنٹ سیکریڑی اور ایک وائس ایڈمرل بیٹھے ہوئے تھے۔ائیر وائس مارشل کی بیٹی نے جو گیارہ بارہ سال کی ہوگی ہم لوگوں کو گلاس میں کوک (Coke) پیش کی اور ائیر وائس مارشل صاحب نے پوچھا اب بتایئے آپ کیا کہہ

رہے تھے۔ میں نے اپنی بات دہرائی کہ مجھے لگتا ہے کہ جنرل ضیاء کو مار دیا جائے گا۔

کہنے لگے ''ان کی جگہ کون آئے گا؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے بے نظیر بھٹو آئیں گی۔''

جوائنٹ سیکریٹری صاحب بولے ''ہم تو اپنی بیوی کو بھی کچھ نہیں بتاتے۔'' میں نے ایئر وائس مارشل سے کہا'' آپ تو اتنے بڑے افسر ہیں اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

کہنے لگے۔ ''شاہد صاحب، اسلام آباد تو اندھا کنواں ہے۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔'' ملاقات برخواست ہوگئی۔ میں دفتر آ گیا۔

دوسرے دن پھر کانفرنس میں گیا اور ایئر وائس مارشل سے درخواست کی اگر مجھے اجازت دیں کہ دوسرے ملکوں سے جو لوگ آئے ہوئے ہیں ان کے انٹرویو کروں۔ انہوں نے کاندھے پر تھپکی دی اور کہا'' جائیں کریں۔''

تین چار دن بعد ریکارڈر کے ایڈیٹر ایم اے زبیری کی طرف سے ایک نوٹس ملا کہ میں نے کانفرنس کی رپورٹنگ کیوں نہیں کی۔

بہت غصہ آیا۔ میں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھ دیا۔

نوکری ختم ہوگئی۔

چند دنوں بعد مجھے اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ میں اسپتال میں تھا کہ جنرل ضیاء کے طیارہ کا Crash ہوگیا۔ طبیعت ٹھیک ہوئی تو میں نے ڈاکٹر ہارون احمد سے پوچھا'' یہ کیا تھا؟'' مجھے کیسے پتہ چلا کہ ضیاء مار دیا جائے گا۔ کہنے لگے:

"It was a Premonition"

اب مجھے یہ کھوج ہوئی کہ Premonition کیا ہوتا ہے۔ کتابیں چھان ماریں۔ پتہ چلا کہ انسانی ذہن بعض حالات میں آنے والے واقعات کی اطلاع دیتا

ہے۔ انسانی ذہن بھی عجب معمہ ہے۔ 1972ء میں ، میں جب بیمار ہوا تھا تو ڈاکٹر ہارون کے پاس ایک چھوٹی سی کتاب دیکھی تھی۔ اس کا نام "How Reliable is the Brain?" تھا۔ ماسکو کی چھپی ہوئی تھی۔ ان سے پوچھوں گا کہ کیا وہ کتاب ان کے پاس اب بھی موجود ہے۔

(یکم مئی ۲۰۱۰ء کراچی)

کمال ہو گیا

دی ہیرالڈ (The Herald) میں میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ہیرالڈ کے ایڈیٹر ثاقب حنیف بہت بے چین تھے کہ میں جلد از جلد ان کا پرچہ جوائن کرلوں۔ اس سے پہلے میں ڈیلی ٹائمز Daily Times میں کام کر رہا تھا اور میرا Permanent job تھا۔ سرفراز احمد ہمارا کراچی کا بیورو چیف تھا۔

ایک دن مجھے پتہ چلا کہ کسی چرچ میں پادری اور اس کے اہل کاروں نے ایک غریب ملازمہ کو مارا پیٹا اور برہنہ کردیا۔ میں نے وہ خبر ڈیلی ٹائمز میں دی جو نمایاں طور پر شائع ہوئی۔

دوسرے دن وہی پادری کراچی پریس کلب پر مظاہرہ کرنے آ گیا۔ گویا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ رات تقریباً بارہ بجے جب میں رضا کے ساتھ کلب سے نکل رہا تھا تو سرفراز کا فون آیا اور اس نے پوچھا میں نے پادری کی خبر کیوں نہیں دی؟ میں نے جواب دیا یہ خبر میں نہیں دوں گا۔ بولا ''آپ استعفیٰ دے دیں'' میں نے جواب دیا ''ٹھیک ہے'' ہیرالڈ والے مجھے پہلے ہی بلا رہے تھے۔

دوسرے دن میں دفتر گیا تو میرے ساتھی مقبول نے سمجھایا کہ میں جھگڑا نہ کروں۔ ہوسکتا ہے دوبارہ ڈیلی ٹائمز میں آنا پڑے۔ خاموشی سے استعفیٰ دے دیں۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک مہینہ کا نوٹس دے دیا۔

اس اثناء میں، میں باقاعدگی سے کام کرتا رہا لیکن سرفراز سے میری بات

چیت بند تھی۔ نوٹس کی مدت ختم ہونے کے بعد Accounts Department گیا اور ان سے اپنے بقایا جات مانگے۔ وہ بولے ہمیں تو کوئی علم ہی نہیں ہے کہ آپ مستعفی ہو گئے ہیں۔

میں واپس آیا تو سرفراز نے بلایا اور پوچھا ''آپ Accounts Department گئے تھے۔'' میں نے کہا ''ہاں آج میرا آخری دن ہے۔'' بولا لیکن میں نے تو آپ کا استعفیٰ ایڈیٹر کو بھیجا ہی نہیں ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیوں نہیں بھیجا؟ تم نے کہا تھا استعفیٰ دے دو، میں نے دے دیا۔ بولا میں سمجھا تھا غصہ میں دے دیا ہے۔ دراز سے میرا استعفیٰ نکالا اور کہا ''دیکھیں میں آپ کے سامنے لکھ رہا ہوں۔ انگریزی میں لکھا "Shahid Hussain is leaving us" میں نے ہیرالڈ جوائن کرلیا۔ ہیرالڈ کے ایڈیٹر ثاقب حنیف نے 35,000 تنخواہ طے کی اور چھ مہینے کا Probation۔ میں نے پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' بولے "It's Just a formality"

تین چار مہینے تو بہت عزت سے گزرے۔ ایک دفعہ ثاقب حنیف کمپیوٹر پر Page بنوا رہے تھے۔ میں پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک دم پلٹے اور معذرت کی۔ کہنے لگے ''شاہد بھائی معاف کیجئے گا میری آپ کی طرف پیٹھ ہو گئی۔''

مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیا میں کوئی پیر ہوں؟

تین چار مہینے بعد انگلی شروع ہوئی۔ مجھ سے کہا آپ کو Local Bodies کا شمارہ خود سے بنوانا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ایک دن جاوید ہاشمی کی کتاب ''ہاں میں باغی ہوں'' تبصرہ کرنے کے لئے دے دی۔ میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ بولے: While everybody is working, You are reading a book" میں نے دل میں سوچا ''حرامی نے خود ہی تو دی ہے۔ پڑھے بغیر کیسے تبصرہ کردیں۔''

یوں لگا کوئی شخص کان بھر رہا ہے۔ خیر جیسے تیسے وقت گزارتے رہے ہیرالڈ میں پندرہ بیس دن کام ہوتا ہے۔ کاپی جانے کے بعد فراغت ہوتی ہے۔ ثاقب حنیف کا کہنا تھا کہ روز گیارہ بجے پہنچ جایا کرو۔ ایک دن فارغ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پانچ چھ اخبار پڑھ ڈالے۔ تھک گیا۔

ہما یوسف جو ہمارے ساتھ بیٹھتی تھی اور بہت اچھا لکھتی تھیں کہنے لگیں ''ریکارڈ رہ گیا۔''

گویا ہمیں بہت دیر سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ بھی تو Harassment at work place ہوا۔ ہمیں اتنی دیر تک کیوں دیکھا؟

افغانستان جانے کا جی چاہ رہا تھا۔ اپنی ایک پرانی دوست سے جو ایک بین الاقوامی NGO میں کام کرتی تھیں کہا ہمیں افغانستان بھیج دیں۔

بولیں ''وہاں کیا ہے؟ بس Mines ہیں۔

ان سے کہا۔ ''بس وہی تو دیکھنی ہیں۔ ہم نے Mines کبھی نہیں دیکھیں۔''

انہوں نے انتظام کردیا۔ الیاس خان سے جو ہیرالڈ میں نمبر ٹو تھے پوچھا کہ ایک NGO ہمیں افغانستان بھیجنا چاہتی ہے۔ چلے جائیں۔ کوئی اعتراض کی بات تو نہیں ہے؟ بولے۔ ''شاہد بھائی چلے جائیں۔'' ثاقب حنیف لندن گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو پوچھا۔ ''آپ کہیں جارہے ہیں؟''

ہم نے کہا ''افغانستان جارہے ہیں۔''

کچھ ناراض سے ہوئے۔ بولے کچھ نہیں۔

ڈان کے محمد علی صدیقی صاحب کو بتایا۔ بولے خیال رکھیے گا اغوا نہ ہوجائیں۔ انہوں نے چھ ماہ قبل کہا تھا کہ آپ ڈان میں آجائیں۔ ان سے پوچھا کیا

اپنا CV ابھی جمع کرادیں یا واپس آکر کرائیں؟ بولے واپس آکر کرادیجئے گا۔

افغانستان میں خوب گھومے۔ بامیان بھی دیکھا اور پہاڑوں سے بنے ہوئے ایک قدرتی غار میں بھی میٹنگ کی۔ واپس آگئے۔

صدیقی صاحب سے ملے اور اپنا CV اور کچھ Clippings لے کر گئے۔ انہوں نے اس زمانے کے ایڈیٹر طاہر مرزا سے ملوایا۔ طاہر مرزا نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی لیکن کچھ لکھنے کو کہا۔ہم نے ڈاکٹر ہارون احمد کا ایک انٹرویو کرلیا اور انہیں دکھایا۔ کہنے لگے۔ ''ڈاکٹر ہارون ہمارے دوست ہیں لیکن Publicity کے بہت شوقین ہیں۔ کچھ اور لکھئے۔''

ہم نے تین چار اور خبریں بنائیں۔ اب ایک اور مسئلہ ہوگیا۔

City Editor کو یہ برا لگا کہ ہم ''اوپر'' سے کیوں آرہے ہیں۔ ہمارے دوست ارمان صابر نے کہا ان سے مل لیں۔ کہہ رہے تھے اوپر سے آرہے ہیں۔ میں نے کہا نوکری کے لئے تو نہیں ملیں گے۔ ادھر ہیرالڈ میں روز یہ پوچھا جاتا تھا کہ کب جارہے ہیں۔ ایک دن غصہ میں زیب اذکار کو فون کیا جو ''دی نیوز'' کے چیف رپورٹر ہیں اور کہا کہ طلعت اسلم سے ہمارا Appointment رکھو۔

طلعت اسلم نے فوراً بلالیا۔ کہنے لگے ہم لوگ ایک Investigative Cell شروع کررہے ہیں۔ سمجھیں آپ کا Appointment ہوگیا۔ تنخواہ شاہ رخ حسن طے کریں گے۔

شاہ رخ سے کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی۔

انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں کہاں ہوآئے؟''

میں نے بتایا کہ ڈیلی ٹائمز اور ہیرالڈ وغیرہ میں کام کیا۔

انہوں نے پوچھا کہ ہیرالڈ میں کتنی تنخواہ ملتی تھی؟

میں نے بتایا کہ 35,000 روپے ملتی تھی۔

طے پا گیا کہ مجھے 35,000 روپے ملیں گے۔

میں نے پوچھا کہ میرا عہدہ کیا ہوگا؟

بولے رپورٹر کا!

میں نے کہا: شاہ رخ صاحب ہیرالڈ میں، میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ ایسا کریں آپ مجھے نمائندہ خصوصی بنادیں۔

شاہ رخ نے طلعت اسلم کو فون کیا اور پوچھا کہ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے اگر مجھے نمائندہ خصوصی بنادیا جائے؟ طلعت نے جواب دیا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اب ایک مرحلہ طے پانا تھا۔ زیب اذکار نے کہا کہ کمال صدیقی سے بھی ملنا ہوگا۔

میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ میں نہیں جانتا۔

بولے: ایڈیٹر رپورٹنگ ہیں۔

کمال صدیقی سے ملاقات ہوئی۔

کمال صدیقی نے اپنے برابر والا کمرہ دکھایا اور کہا آپ کا میٹر چالو ہوگیا ہے۔ ابھی اس کمرے میں کمپیوٹر وغیرہ لگنے ہیں۔ آپ ایک مہینے بعد آئیں۔

میں نے کہا ایک NGO مجھے بالاکوٹ بھیجنا چاہتی ہے۔ وہاں کے زلزلے کو Cover کرنے کے لئے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں وہاں چلا جاؤں، زلزلہ سے متعلق خبریں ''نیوز'' کے لئے بھی بھیجتا رہوں گا۔ بولے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

میں مانسہرہ چلا گیا جہاں اس NGO کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ رہائش ایبٹ آباد میں

تھی۔ زلزلہ کو کور کیا۔ بہت سردی تھی۔ لیکن مجھے مزہ آرہا تھا۔

زیب اذکار کا فون آیا کہ اپنی CV فوراً بھیجیں۔ وہ میں نے E-mail کے ذریعہ بھیج دی۔

واپس آکر جب میں نے اپنا Appointment Letter دیکھا تو تنخواہ 25,000 تھی اور عہدہ سینئر رپورٹر کا تھا۔

کمال صدیقی کے پاس گیا تو وہ میرے Visiting Card لئے بیٹھے تھے Senior Reporter کے۔ میں نے کہا کمال صاحب میں Special Correspondent ہوں اور میری تنخواہ 35,000 طے ہوئی تھی۔ بولے ہمارے یہاں Special Correspondent کا کوئی عہدہ نہیں ہوتا۔ یہ ان لوگوں کو دے دیتے ہیں جو جنگ میں کام کرتے ہیں لیکن جن کی خبریں نیوز میں بھی چھپتی ہیں۔ میں نے کہا کہ میری تنخواہ 35,000 طے ہوئی تھی۔ بولے ایک درخواست دے دیں۔ شاہ رخ حسن سے بات کرتے ہیں۔

اب میں بار بار درخواست دے رہا ہوں۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ شاہ رخ حسن نے کہہ دیا کہ انہیں یاد نہیں کہ تنخواہ 35,000 طے ہوئی تھی۔

کمال صدیقی نے بتایا کہ Investigative Cell کے لوگ ہفتے میں صرف دو خبریں دیں گے۔

میں نے دو خبریں دینا شروع کر دیں۔

اس اثناء میں مجھے ہیرالڈ میں شائع ہونے والے ایک مضمون پر Asian Development Bank Institute(ADBI) کی طرف سے ایک ایوارڈ مل گیا۔ یہ غربت سے متعلق ایک مضمون پر تھا اور میں Second Runner up تھا۔ تمام خرچہ ADBI نے برداشت کیا تھا سوائے Incidental Charges کے۔ اس

زمانے میں شاہ رخ حسن ہمارے ساتھ میٹنگ میں بیٹھتے تھے جو صبح گیارہ بجے ہوتی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایوارڈ ملا ہے۔ بہت خوش ہوئے بولے یہ خبر اخبار میں شائع ہونی چاہیے۔

میں منیلا چلا گیا جہاں ایوارڈ کی بہت شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ واپس آیا تو کمال صدیقی بولے مضمون چونکہ ہیرالڈ میں شائع ہوا تھا لہٰذا نیوز میں خبر نہیں چھپے گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ چلو کوئی بات نہیں۔

میں The Sunday Indian کا بیورو چیف بھی تھا اور L.A. Times وغیرہ کے لیے بھی کام کر لیتا تھا۔ The Sunday Indian کی AGM تھی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں نے طلعت اسلم سے ایک ہفتہ کی چھٹی لی اور دلّی چلا گیا۔ وہاں میری بہت پذیرائی ہوئی کیونکہ میں نے بے نظیر کے قتل کی بروقت خبر دی تھی کہ سنڈے انڈین نے اپنے حریف India Today اور Frontline کو جو بہت پرانے اور جمے ہوئے پرچے تھے مات دے دی تھی۔

واپس آیا تو کمال صدیقی بولے آپ بغیر اجازت ہندوستان کیوں گئے تھے۔ یہ شاہ رخ کو پتہ چل گیا ہے۔ آپ کو ایک E-mail بھیجوں گا۔ میں نے کہا کہ میں طلعت اسلم سے چھٹی لے کر گیا تھا اور آپ ملک سے باہر تھے اور چھٹی میں میری مرضی ہے جہاں بھی جاؤں۔

کمال صدیقی نے ایک لمبا چوڑا E-mail مجھے بھیجا۔ میں نے بھی بہت غصہ میں جواب دیا اور بتایا کہ 1973ء سے صحافت سے منسلک ہوں اور گارجین جیسے اخبار کے لئے لکھتا رہا ہوں۔ اس کی ایک کاپی میں نے شاہ رخ اور طلعت اسلم کو بھی بھیج دی۔

تقریباً چار سال بعد میں شاہ رخ کے پاس گیا اور کہا کہ میری تنخواہ میں

اضافہ ہونا چاہیے۔ وہ بولے ہمیں تو جو ایڈیٹر لکھ کر بھیجتے ہیں، ہم وہی کرتے ہیں۔
معلوم ہوا کہ کمال صدیقی مسلسل میرے خلاف رپورٹیں بھیجتے ہیں۔ حتیٰ کہ The
News on Sunday میں بھی انہوں نے میرے خلاف E-mail لکھا اور ایڈیٹر
فرح ضیا کو لکھا کہ میرے مضامین شائع نہ کریں۔

لڑکیوں کو مسلسل منع کیا جاتا کہ میرے کمرے میں نہ جایا کریں۔

اس اثناء میں سلطان لاکھانی نے The Tribune لانچ کیا۔ کمال صدیقی
نے وہاں گفت وشنید شروع کر دی۔ چند دنوں بعد The Tribune چلے گئے۔

(۲۶ر فروری ۲۰۱۱ء، کراچی)

آپ کہیں جائیں گے نہیں

غالباً 1990ء تھا جب میری طبیعت کچھ بے چین ہونے لگی۔اضطراب کی سی کیفیت تھی اور جوں جوں گرمی بڑھتی گئی،اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔کچھ غصہ بھی بڑھ گیا اور خوابوں کی شدت بھی بڑھ گئی۔

رات بزم میں جاگتا خواب یہ دیکھا
ہمیں چراغ، ہمیں پروانے

فراق صاحب کا یہ شعر کتنا بڑا ہے۔تکمیل (Totality) اور Wholeness کی علامت!

فراق کی مانند ہمیں بھی جاگتا خواب دیکھنے کی عادت ہے۔میں منصوبے بنانے لگا۔کبھی ایران جارہا ہوں،کبھی امریکہ۔ڈاکٹر ہارون احمد کے پاس گیا تو انہوں نے پہلے تو تھپکی دی کہ جاؤ۔کچھ عرصے بعد گیا تو کہنے لگے"اب آپ بالکل ٹھیک ہوگئے ہیں،کہیں جائیں گے نہیں۔"

ایک رات ڈاکٹر مظہر حیدر سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا"یہ ڈاکٹر ہارون مجھے کہیں جانے کیوں نہیں دیتے؟" کہنے لگے Lonely Feel کرتے ہوں گے!"

ہماری دوست لالہ نے پوچھا"امریکہ کا ویزہ لگوالیا ہے؟"

میں کچھ بولا نہیں۔میں ویزے کے بغیر ہی جارہا تھا۔

ڈاکٹر ہارون نے کہا! "Dream Children"

خیر امریکہ اور ایران طوران کو تو نہیں گئے۔اسلام آباد چلے گئے۔نسرین نے اسلام آباد کا تبادلہ کروالیا تھا۔تین سال بعد پھر کراچی واپس آ گئے۔

اتنے عرصے بعد باہر جانے کی دھن ذہن پر پھر سوار ہو گئی ہے۔لگتا ہے۔نوکری بہت دن کرلی۔پانچ سال ہونے کو آئے ہیں۔تنخواہ بڑھانے کا نام نہیں لیتے۔ہمارے ایک دیرینہ دوست نے جو خیر سے امریکہ میں رہتے ہیں کہا یہاں آ جاؤ۔میں نے پوچھا کیسے آ جاؤں،میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔کتنی بھی محنت کرلو بچت ہی نہیں ہوتی کہنے لگے ویزا لگواؤ میں آنے جانے اور رہائش کا بندوبست کردوں گا۔دل کو حوصلہ ہوا۔اسی اثناء میں امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے دعوت نامہ ملا کہ ہمارے یہاں آیئے اور لیکچر دیجئے،یقین نہ آیا۔لیکن انہوں نے ایک Scan کیا ہوا خط بھیج دیا۔امریکہ کے ویزا فارم میں جو سوالات کئے گئے ہیں انہیں پڑھ کر تو لگتا ہے کہ ہم انتقال فرما گئے ہیں اور منکر نکیر سوالات کئے جارہے ہیں۔طبیعت مکدّر ہوگئی۔بہرحال ویزا فارم تو بھرنا تھا۔

ڈاکٹر ہارون کے پاس گئے اور بتایا کہ جون میں امریکہ جانے کا ارادہ ہے۔کہنے لگے کوئی فیلو شپ مل گئی ہے؟میں نے بتایا کہ فیلو شپ نہیں ملی ہے۔ایک پرانا دوست ٹکٹ بھیج رہا ہے اور ایک یونیورسٹی کہہ رہی ہے ہمارے یہاں آ کر لیکچر دو۔پوچھا''رہو گے کہاں؟''

پھر خود ہی جواب دیا''اپنے دوست کے پاس رہو گے۔''

میں نے یہ بھی بتایا کہ میرا ارادہ کتاب لکھنے کا ہے۔ایک تو کہانیوں کی کتاب،ایک Heritage پر مضامین کا Compilation اور ایک فطرت پر کتاب۔ کہنے لگے اگلے مہینے آنا۔میں نے کہا ٹھیک ہے۔اس دفعہ مجھے کچھ کچھ لگ رہا ہے چلا جاؤں گا۔نیویارک سے ہمارے دوست ابراہیم ساجد کا پیغام آیا:

Young blonde girls are waiting for you in New York.

ڈاکٹر احتشام کا پیغام آیا کہ ہمارے گھر پر قیام کریں، نیاگرافال سے دو میل دور ہے۔عرض کہ سارے دوستوں نے دعوت دے دی۔اب دیکھیں ویزا ملتا ہے یا نہیں۔امید تو ہے کہ مل جائے گا۔

L.A.Times کے Bruce Wallace کو بھی لکھ دیا ہے کہ ہمارا امریکہ آنے کا ارادہ ہے اور Alternate Radio کے ڈائریکٹر David کو بھی بتادیا ہے۔ان کا پیغام آیا، اردو میں ''سفر مبارک!''

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ امریکہ نہ جائیں۔اس سے کہیں بہتر تو خیالوں کا سفر ہوتا ہے۔جہاں چاہیں چلے جائیں۔لیکن اس بار خیالوں کو حقیقت کا روپ دینے کی ٹھانی ہے۔تصور میں رنگ بھرنا ہے۔

نسرین کہنے لگیں ''سنا ہے امریکی ایک مشین سے ننگا گزارتے ہیں۔ہم نے کہا ''ضرور گزاریں ہمارا تو جی ویسے بھی کپڑے پہننے کو نہیں چاہتا۔الجھن ہوتی ہے۔'' کہنے لگیں ''آپ تو ہمیشہ عجیب باتیں کرتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''تم امریکہ جانا نہیں چاہتیں۔''

کہا ''میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی بھاڑ میں گیا امریکہ!''

ادھر ہمارے صاحبزادے بھی امریکہ جانے کی سوچ رہے ہیں۔سول انجینئرنگ میں B.E کرلیا ہے۔کہیں نوکری نہیں ملتی۔منصوبہ بنایا ہے کہ امریکہ جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔

(کراچی ۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء)

روانگی

میں نے کراچی سے حفیظ صدیقی کو فون کیا اور کہا کہ میں اسلام آباد آنا چاہتا ہوں اور پاکستان ٹائمز (Pakistan Times) میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کتنی تنخواہ مل جائے گی؟ کہنے لگے۔ ''دس ہزار مل جائے گی۔''

میں بہت خوش ہوا۔ ڈیلی نیوز (Daily News) میں صرف ساڑھے پانچ ہزار ملتے تھے۔ بس میں بیٹھ کر اسلام آباد پہنچ گیا اور اپنی پھوپھی زاد بہن پروین کے گھر ٹھہر گیا۔ حفیظ صدیقی نے پاکستان ٹائمز میں سفارش کر دی۔ سب ایڈیٹر کے لئے۔ اب کام کئے جا رہے ہیں۔ تنخواہ ملتی ہی نہیں ہے۔ وہیں اشرف خان سے ملاقات ہوئی۔

پاکستان ٹائمز میں کوئی تین مہینے کام کرنے سے پہلے، ایک دن حفیظ صدیقی کے ساتھ ایم این اے ہوسٹل میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ مجھ سے کہنے لگے ساری رات تمہاری Movement دیکھتا رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری Movement کیوں دیکھتے رہے۔

کہنے لگے۔ ''انقلاب لا رہے تھے۔''

''اور یہ دہقانی جوتے کیوں پہنے ہوئے ہیں؟''

میں کچھ نہیں بولا۔ بولے ''پاکستان ٹائمز'' میں علاج ہو جائے گا۔ باہر بھی بھیج دیتے ہیں۔

پھر اپنے قصے سنانے لگے۔ امریکہ گئے تھے تو کیا تیر مارا اور یہ کہ میر شکیل اور میر جاوید ان کے شاگرد رہے ہیں۔

دو تین مہینے ''پاکستان ٹائمز'' میں بغیر تنخواہ کے کام کیا۔ پھر کراچی آ گیا۔ Finance Daily کے شاہ صاحب نے بلایا اور کہا ہم اسلام آباد میں بیورو آفس کھول رہے ہیں، آپ وہاں جائیں، دوبارہ آ گیا اور Finance Daily میں کام کرنے لگا۔ اشرف بھی یہاں آ گیا۔ ایک بہت بڑے بنگلے میں دفتر تھا۔ اشرف کہیں سے World Bank کی ایک موٹی سی رپورٹ لے آیا تھا۔ ہم دونوں روز اس سے خبریں بناتے اور کراچی بھیج دیتے۔ تنخواہ ملتی رہی۔

اس اثناء میں امی نے ہمارے رشتے کے بھائی کا ایک خط بھیجا اور کہا جا کر دی مسلم کے مالک سے ملو۔ اور ایک دفعہ بھائی صاحب کو فون کرلو۔ میں نے فون تو نہیں کیا لیکن ایک دن دی مسلم کے مالک مرتضٰی پویا کو فون کردیا۔ فوراً گھر پر بلا لیا گیا۔ ان کے یہاں پردہ بہت ہوتا ہے لیکن دروازے کھول دیئے ۔ فوراً The Muslim کے Chief Executive کو فون کیا۔ ہوا کچھ بھی نہیں۔

ایک دن The Muslim کے دفتر کے پاس مشتاق گزدرمل گئے۔ اپنی کسی ٹیم کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ کھانا کھلایا اور بتایا کہ ''مسلم'' میں ان کے بہت پرانے دوست ہیں اب ''مسلم'' کے چکر لگ رہے ہیں۔ ہوتا ہواتا کچھ بھی نہیں۔

ایک دن ''مسلم'' کے پاس سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے بڑی زور دار آواز آئی ''ابے شاہد، یہ پنجابیوں کے شہر کہاں آ گیا ہے؟'' پلٹ کر دیکھا تو ہمارا پرانا دوست نبی بخش کھوسو نظر آ گیا۔ اپنے گھر لے گیا۔ کھانا کھلایا اور دوسرے دن دفتر آنے کی تاکید کی۔ وہ Establishment Division میں جوائنٹ سیکریٹری لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے سندھ کا انفارمیشن سیکریٹری تھا۔ کھوسو نے فرہاد زیدی کو فون کیا جو دی مسلم

کے چیف ایگزیکٹو تھے۔انہوں نے بلالیا۔بولے:"اپ تو وہی ہیں!"

میں کچھ بولا نہیں۔ دی مسلم کی Business Desk پر بطور سب ایڈیٹر(Sub-Editor) Appoint ہوگیا۔

سلامت علی ایڈیٹر تھے۔خالد صاحب نیوز ایڈیٹر اور انور خلیل Co-ordi-nating ایڈیٹر۔کبھی کبھی سلطان احمد بھی آجاتے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اداریہ لکھ دیتے تھے۔ ایک دن جاوید بخاری آ گئے۔مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔"آپ یہاں پہنچ گئے۔"اور آگے بڑھ گئے۔

ہمارے انچارج ایک صاحب تھے جن کا نام قریشی تھا۔ان کی انگریزی بڑی واجبی تھی۔ایک کونے میں Eric Cyprian بھی بیٹھتے تھے۔وہ اداریہ لکھتے تھے۔کیا بڑھیا انگریزی تھی۔The Muslim کا سب سے دلچسپ کردار بڑے پویا کے بیٹے چھوٹے پویا تھے۔

Telex پر خبریں آتی تھیں اور لوگ ٹائپ رائیٹر پر کام کرتے تھے۔ دفتر میں ایک عدد کمپیوٹر بھی تھا جس پر Stock کی خبریں آتی تھیں۔

چھوٹے پویا کا جواب نہ تھا۔ٹیلکس کا کوئی Alphabet ٹوٹ گیا۔یہ کوئی ایسا Alphabet تھا جو تقریباً ہر لفظ میں استعمال ہوتا تھا۔اور سب ایڈیٹر کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔وہ بار بار شکایت کرتے تھے۔

عاجز آ کر Telex Operator نے وہ Alphabet خود ہی لگادیا۔پچاس روپے کا خرچہ ہوا۔چھوٹے پویا نے ایک دن اسے بلایا اور کہا کہ سنا ہے تم نے ٹیلکس کا ایک Alphabet لگایا ہے؟

اس نے حامی بھری اور کہا لوگ بار بار شکایت کرتے تھے،میں نے سوچا تھوڑا سا تو خرچہ ہے،خود ہی لگادیتا ہوں۔

بولے''تم کون ہوتے ہو لگانے والے جاؤ اسے توڑ کر آؤ۔''

اس نے جا کر دوبارہ توڑ دیا۔یہ واقعہ اس Telex Operator نے جس کا مجھے نام یاد نہیں خود بتایا۔

''دی مسلم''میں تنخواہوں میں دیر ہوتی تھی اور کم بھی ملتی تھی لیکن یہ اپنے زمانے کا بہت بڑا اخبار تھا۔وزیراعظم کی میز پر سب سے پہلے''دی مسلم''ہی پہنچتا تھا۔ابھی''ڈان''اسلام آباد سے نکلنا شروع نہیں ہوا تھا۔

میں Business Desk پر کام کرتا تھا۔ایک دن ایڈیٹر سلامت علی نے مجھے Assignment دیا کہ پنڈی میں NUST کی ایک پریس کانفرنس ہے۔آپ وہاں جائیں۔NUST اور کسی غیر ملکی کمپنی کے درمیان Satellite Exchange کا کوئی معاہدہ ہوا تھا۔

تقریب میں NUST کے ایک کرنل صاحب میرے پاس آئے کہنے لگے۔''کسی روز ہمارے یہاں تشریف لائیں۔''میں سمجھا یونیورسٹی پر کوئی فیچر اسٹوری چاہتے ہوں گے۔حامی بھرلی۔

ایک دن فون کرکے وہاں پہنچ گیا۔سب سے پہلے ایک ریٹائرڈ میجر کے کمرے میں بٹھایا گیا۔سردیوں کے دن تھے۔ہیٹر جل رہا تھا۔میری خوب خاطر مدارات ہورہی تھی۔اور مجھے الجھن ہورہی تھی کہ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں۔Campus کیوں نہیں دکھاتے۔

میجر صاحب کہنے لگے۔''بیٹے آپ کو ایک اسٹوری دوں۔کسی کو بتائیں گے تو نہیں؟''

میں نے حامی بھرلی انہوں نے مجھے فوجی اسپتالوں میں گڑ بڑ کے بارے میں ایک اسٹوری دی۔نوٹس لے لئے۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد کرنل صاحب کے کمرے میں بھیجا گیا۔دوبارہ خاطر مدارات شروع ہوگئی۔کرنل صاحب نے کہا دراصل ہمارے Rector آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس کچھ گورے بیٹھے ہوئے ہیں۔اس لئے دیر ہورہی ہے۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد ایک بہت بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔وردی میں ملبوس ایک جنرل بیٹھے ہوئے تھے۔کرنل صاحب سیلوٹ مار کر دور کھڑے ہوگئے۔جنرل صاحب کا تعلق Engineering Corps سے تھا۔

انہوں نے کرنل صاحب سے کہا"Have a seat"

اب پھر ایک بیرہ آیا۔ہاتھوں میں دستانے۔مجھے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں پیش کی گئیں۔

اس کے بعد جنرل صاحب بولے"اگر کسی کو آپ کے پاس بھیج دیں تو آپ آجائیں گے؟"

سمجھ میں نہیں آیا کسے بھیج رہے ہیں۔دل میں سوچا آ تو گیا ہوں۔

پھر کہنے لگے۔آپ ہمیں Ideas دیں۔آپ بالکل آزاد ہوں گے۔ہم ان Ideas پر دستاویزی فلمیں بھی بنائیں گے اور اپ کو Pay کریں گے۔

میں نے پوچھا مثلاً کیسے آئیڈیاز؟ بولے یہ بتائیں درسگاہوں میں تشدد کیسے روکا جا سکتا ہے؟

پھر بولے"Don't Malign !"

میں نے سوچا دھمکی دے رہے ہیں۔

میں نے ان سے ایک اور جنرل صاحب کے بارے میں دریافت کیا جنہیں میں پہلے سے غائبانہ جانتا تھا۔

کہنے لگے"Old is Gold"

میں نے اجازت چاہی۔کہا "دفتر پہنچ کر Idea فیکس کر دوں گا۔"
دی مسلم کے دفتر پہنچ کر ٹائپ رائٹر اٹھایا۔اور ہیڈ لائن لکھی "Greenery Generates Happiness"

دوسرے دن کرنل صاحب کا فون آیا۔"سر سمجھ میں نہیں آیا۔"
میں نے Idea بھیج دیا۔اب سمجھ میں نہیں آیا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔کراچی آ گیا۔

(Alexendria, VA July 30, 2010)

دوا

اسلام آباد جانے سے پہلے ڈاکٹر ہارون سے ملا۔کہنے لگے:

"Shahid, Asif Nawaz was the last of the liberal generals. Don`t do any thing provocative in Islamabad, you are under military surveillance. Give me a ring".

میں نے پوچھا اسلام آباد میں اگر میری طبیعت خراب ہوجائے تو کس سے ملوں۔ایک بریگیڈیئر کے نام کارڈ لکھ دیا جو PIMS کے Executive Director تھے اور پروفیسر بھی تھے۔PIMS میرے گھر کے بہت قریب تھا۔ایک دن وہاں گیا اور پروفیسر ہی کو کارڈ بھجوادیا۔وہ کمرے سے باہر آئے۔غالباً وہ سمجھے کہ ڈاکٹر ہارون بذات خود ملنے آئے ہیں۔مجھ سے History پوچھی اور Blood Test کے لئے CMH راولپنڈی جانے کو کہا۔کہنے لگے''صبح نو بجے نہار منہ جانا ہے''۔ میں دوسرے دن آرام سے اٹھا اور بارہ ایک بجے نہار منہ جا کر ٹیسٹ کرالیا۔رپورٹ لے کر پروفیسر کے پاس گیا۔کہنے لگے:

''9 بجے کا مطلب ہے 9 بجے ۔پھر ٹیسٹ کرائیں۔''

ان کے انڈر میں ایک جونیئر ڈاکٹر بھی تھے۔ان کا نام ڈاکٹر مسرت تھا۔ رجسٹرار بھی تھے۔انہوں نے Priedel چھڑانے کا کام شروع کردیا کہنے لگے۔''شاہد صاحب It has injurious side effects''

''ڈاکٹر ہارون کو مت بتایئے گا۔وہ ناراض ہوں گے۔''

ایک گولی کے بجائے آدھی کردی۔ پھر آدھی بھی ختم کردی۔ یوں لگا جیسے ایک دم سے بھوک کھل اٹھی ہے اور توانائی بھی آ گئی ہے۔ ایک اپنی Nursing پر لکھی ہوئی ایک کتاب دی۔ The Muslim میں Review کرنے کے لئے۔ میں نے ڈاکٹر ہارون کو ایک امریکی شاعر کی ایک نظم لکھ کر بھیج دی۔

ان کی چٹھی آئی "Shahid please take lithium"

کراچی آ کر ڈاکٹر مظہر کو واقعہ سنایا تو بولے:

"اسلام آباد کی دوا اور ہے، کراچی کی دوا اور"

(Alexendria, VA 30 July 2010)

جوتا

نسرین نے کرائے کا فلیٹ لے لیا۔یہ G-8 Markaz میں واقع تھا۔ ہمارے گھر اشرف آیا کرتا۔اس کا اور میرا جوتا ایک ہی سائز کا تھا۔میں نے جوتا خریدا۔اشرف کو وہ پسند آ گیا۔مجھ سے کہنے لگا ایک ہفتہ کے لئے تمہارا جوتا لے جارہا ہوں۔میں نے کہا کوئی بات نہیں۔مجھے پتہ نہیں تھا کہ علیزہ ہماری یہ حرکت دیکھ رہی ہے۔تین چار سال کی ہوگی۔ایک آدھ ہفتے بعد اشرف آیا تو اس نے اسٹور سے لاکر اس کا جوتا اس کے پیروں کے پاس رکھ دیا۔کہنے لگی اپنا جوتا واپس لے لیں۔میں بڑا شرمندہ ہوا۔

کچھ عرصہ بعد اشرف ایک نیا کوٹ پہن کر آیا۔علیزہ بولی''اشرف انکل یہ کوٹ کس کا ہے؟''

اشرف نے کراچی میں شادی کی۔مجھے نہیں بلایا۔شکایت کی تو کہنے لگا: ''ارے بھائی علیزہ پوچھتی یہ سوٹ کس کا ہے؟''

(Alexendria Va 30 July 2010)

چھوٹے پوپا

چھوٹے پوپا بھی کیا چیز تھے۔ایک دن میں دفتر آیا تو معلوم ہوا کہ میری چھٹی ہوگئی ہے۔خیر میں نے خاموشی سے اپنے بقایاجات کا چیک لے لیا۔کوئی آٹھ ساڑے آٹھ ہزار کی رقم تھی۔کئی مرتبہ بینک گیا لیکن وہ چیک ہر بار Bounce ہو جاتا تھا۔

ایک رفیق کو فون کیا۔بولیں:

''ارے شاہد صاحب کیا بتائیں۔یہ عجیب لوگ ہیں۔ایک فیکس مشین میں باہر سے لائی تھی۔کچھ دنوں کے لئے لی آج تک واپس نہیں کی۔''

ہمارا کرائم رپورٹر کہنے لگا:

''شاہد صاحب کیا بتائیں۔ دُھری نوکری کرنی پڑرہی ہے۔ ایک تو کرائم رپورٹنگ کرو۔دوسرے چھوٹے پوپا کو تھانے سے بھی چھڑا کر لاؤ۔عجیب شوق ہیں اس آدمی کے۔تنخواہ پھر بھی نہیں ملتی۔''

(Alexendria, Va 30 July 2010)

سب ایڈیٹر

میں بزنس ڈیسک پر کام کرتا تھا۔"دی مسلم" کے ایڈیٹر نے جو بڑے حلیم شہیم تھے مجھے کہا آپ Chaklala جائیں۔امریکہ سے Energy Delegation آ رہا ہے۔اسے Cover کریں۔میں Chaklala Airport پہنچ گیا۔ابھی جہاز کی Landing میں دیر تھی۔سارے صحافی ایئرپورٹ پر گھوم رہے تھے۔مجھے ایک امریکی نظر آیا جو بہت Active دکھائی دیا۔اس سے ہاتھ ملایا۔اپنا کارڈ دیا۔کہنے لگا۔

"Why are you here"

بات درست تھی۔

Sub Editor کا کام رپورٹنگ کرنا نہیں ہوتا۔یہ رپورٹر کا کام ہوتا ہے۔

میں نے کہا: "I have been given an assignment by my editor" - اس نے اپنا کارڈ دیا۔اس کا نام Brent Buyers تھا۔وہ امریکی سفارت خانے میں Media Affairs کو دیکھتا تھا۔اس نے بتایا کہ وہ دس سال تک صحافی رہا ہے۔میں نے اس سے کہا کہ مجھے جلد اسٹوری فائنل کرنا ہوگی۔میں چاہتا ہوں کہ انرجی ٹیم کا CV مجھے دفتر جانے سے پہلے Fax کر دیا جائے۔

جب دفتر پہنچا تو تمام معلومات میری میز پر رکھی ہوئی تھیں۔میں نے جیسے تیسے اسٹوری بنائی۔بہت تھکا ہوا تھا۔صبح کو"دی مسلم" کی پہلی لیڈ تھی شاید دوسرے یا

تیسرے دن امریکی لائبریری میں Satellite کے ذریعے ایک Discussion تھا۔ مجھے بھی بلایا گیا۔میں بولا کچھ نہیں بس دیکھتا رہا کہ Satellite کے ذریعے مکالمہ کیسے ہوتا ہے۔Brent Buyers سے میری دوستی ہوگئی۔میں نے اسے Nature کے بارے میں جو لکھا تھا وہ دکھایا۔

بولا "So you have a theory"

امریکن لائبریری میں صحافی Shakeel shaikh سے بھی ملاقات ہوئی۔کہنے لگا "شاہد صاحب رہنا تو اسی ملک میں ہے!"

(Alexendria, Va 30 July 2010)

بھول

ہماری ایک دوست ہیں۔ بہت پیاری اور سادہ۔ ان کو ہم زمانے سے جانتے ہیں۔ اچھی لگتی ہیں۔ کوئی کام ہو تو منٹوں میں نمٹا دیتی ہیں۔ ایک دفعہ ہماری طبیعت خراب ہوئی۔ (ہمارے دوست ڈاکٹر مظہر کہتے ہیں کہ طبیعت اچھی ہوگئی تھی!) تھوڑے سے پیسے تھے۔ جا کر Sheraton ہوٹل میں بیٹھ گئے اور میوزک سننے لگے۔ جوس بھی منگا لیا۔ بیرا جوس لے آیا۔ بیٹھے میوزک سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیرا بل لے آیا اب بل جو دیکھا تو زیادہ تھا۔ ہمارے پاس پیسے کم تھے۔ ہم نے بیرے سے کہا ابھی انتظار کرو۔ میوزک سنتے رہے۔ وہاں سے ہم نے ڈاکٹر مظہر کو فون کیا کہ یہاں آجایئے۔ کہنے لگے آتا ہوں۔ آئے نہیں۔ پھر ایدھی کے یہاں ایک دوست کو فون کیا۔ وہ بھی نہیں آیا۔ ہماری ایک ماسی تھیں۔ ممتاز نورانی بہت خوبصورت اور محبت کرنے والی۔ ہم نے ان کو فون کیا اور ان سے کہا کہ ہم یہاں Sheraton میں گروی ہیں۔ ہماری دوست کو فون کر دیں کہ تھوڑی دیر کے لئے یہاں آجائیں۔ ماسی نے فوراً فون کر دیا۔ اتفاق سے ہماری دوست کے پاس ہمارا ایک بہت پرانا دوست بھی بیٹھا ہوا تھا۔ جب ماسی کا فون آیا۔ تو وہ وہیں تھا وہ بھی نہیں آئیں۔

بیرے کی ڈیوٹی ختم ہو رہی تھی۔ وہ ہمارے پاس آیا کہ بل دے دیجیے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ اتنے میں ایک فلسطینی لڑکا ہمارے پاس آیا جو بہت دیر سے خود بھی میوزک سن رہا تھا۔ کہنے لگا "برادر کوئی مسئلہ ہے۔" ہم نے اسے بتا دیا کہ

بے خیالی میں ہم یہاں آکے بیٹھ گئے تھے اور خیال ہی نہیں کیا کہ جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ کہنے لگا کوئی بات نہیں میں دے دیتا ہوں۔ آپ واپس کر دیجیے گا۔ اس نے بل دے دیا۔ ہماری جیب میں چیک بک Cheque Book تھی۔ اسے چیک کاٹ کر دے دیا اور بتایا کہ ہم Frontier Post میں کام کرتے ہیں۔ وہاں آکر لے لینا۔ ہمارے دوست الطاف صدیقی مرحوم اس زمانے میں Frontier Post کے بیورو چیف تھے۔ ابھی ہم نے وہاں کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ صرف ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہاں جاتے روز تھے۔ دوسرے دن وہ فلسطینی لڑکا Frontier Post کے دفتر گیا اور غالباً الطاف نے پیسے دے دیئے۔

کافی دنوں بعد ہمارے سندھی دوست نے بتایا کہ جب ہماری دوست کے پاس ماسی کا فون آیا کہ شاہد Sheraton میں تمہارا انتظار کر رہا ہے تو وہ ڈر گئی تھیں۔ حالانکہ ڈرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ صرف سوسوا سو روپے کا بل دینا تھا۔

پچھلے دنوں طبیعت میں پھر بے چینی پیدا ہوئی۔ ہماری ایک اور پرانی دوست کا امریکہ سے فون آیا کہ ہمارے لئے Heritage پر ایک Presentation لکھ دو۔ وعدہ کرلیا۔ پھر پیغام آیا جلدی لکھ دو۔ ہم نے کہا ابھی تو ہم تھرپارکر جا رہے ہیں۔ واپس آکر لکھ دیں گے۔ Face book پر غصہ سے بھرا پیغام آیا ''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟'' بہت غصہ آیا۔ لکھ دیا کہ تم ہمیں ابھی تک این ایس ایف کا ورکر سمجھ رہی ہو جس سے لوگ کام لئے جا رہے ہیں۔ ہم اب پاکستان اور ہندوستان دونوں میں ایک اچھے صحافی کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ تم اپنے میاں سے کیوں نہیں لکھوالیتیں؟ وہ بہت قابل ہے ہم سے اچھی Presentation لکھ دے گا۔ اس کا شوہر بھی ہمارا بہت پرانا دوست ہے۔ انگریزی اور انگریزی لسانیات میں ڈگری یافتہ ہے۔ وہ بھی انگلستان سے۔

ہم تھر پارکر چلے گئے۔ واپس آئے تو ایک بہت پرانے سرجن کا جواب ریٹائر ہوگئے ہیں اور امریکہ میں رہتے ہیں پیغام آیا کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔آپ دونوں ایک جان دوقالب ہیں۔ بہت سوچا۔ یاد نہیں آیا کہ ہم ایک جان دوقالب کب تھے۔ اچھے دوست تھے اور این ایس ایف میں کام کرتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہوجاتی تھی۔بس۔

پی آئی اے کی فلائٹ سے نیویارک پہنچے تو جس دوست کے پاس ہمیں ٹھہرنا تھا وہ واشنگٹن ڈی سی میں تھا۔ کراچی میں ایک بہت اچھے دوست نے نیویارک کے ایک Hotel کا پتہ بتایا تھا کہ جا کر وہاں ٹھہرے گا۔ بڑا Artistic Hotel ہے۔ اس کے ہر کمرے میں کسی نہ کسی آرٹسٹ نے جو وہاں رہا ہے، دیواروں پر تصاویر بنائی ہیں۔ جو کمرا مجھے ملا اس میں کمبوڈیا کی تصاویر تھیں۔ ۸۰ڈالر یومیہ کرایہ تھا، بغیر ناشتے کے اور ۵۰ڈالر اور ایک گولڈ لیف (Gold Leaf) کا پیکٹ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیا تھا اپنی مرضی سے۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ اس طرح تو گزارا ہونا مشکل ہے۔ انٹرنیٹ پر میں نے ابراہیم ساجد اور اپنی پرانی دوست زلیخا کو پیغام دیا کہ میں نیویارک آ گیا ہوں۔ ابراہیم ساجد کا فون آیا کہ شاہد بھائی میں تو واشنگٹن ڈی سی میں ہوں اور تین دن بعد نیویارک آؤں گا۔ زلیخا کا فون آیا کہ تم China Town جاؤ، وہاں سے ایک بس ملے گی اس میں آ جاؤ۔ ۲۰ڈالر کرایہ لگے گا۔ میں نے ایک دکان سے ۱۲۵ڈالر کا ایک نیا Cell Phone خریدا اور Alexendria آ گیا۔

زلیخا اور یوسف دونوں پرانے دوست ہیں۔ زلیخا سرسید کالج کی یونین کی صدر ہوا کرتی تھی اور مباحثوں میں حصہ لیتی تھی۔ یوسف کا تعلق سکھر سے تھا۔ بعد میں کراچی آ گیا۔ اس نے انگریزی اور لسانیات میں انگلستان سے ماسٹرز کیا تھا۔

ان کا بڑا خوبصورت گھر ہے۔ پچھلے حصہ میں بہت سے پیڑ ہیں۔ لگتا ہے جنگل میں بیٹھے ہیں۔ میں وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ زلیخا کہتی باہر کیوں نہیں جاتے؟ جا کر

میوزیم دیکھو۔ میں کہتا میں تھک گیا ہوں۔ کہتی تم نے کیا کیا ہے جو تھک گئے ہو؟ میں کہتا میں سوچ رہا ہوں اور سوچنا سب سے زیادہ تھکا دینے والا کام ہے۔

پھر Holocaust Museum دیکھنے گیا لکھنا بھی شروع کر دیا۔

ڈاکٹر عائشہ کا پیغام آیا کہ ان کا ڈائریکٹر (Director) کسی مسئلہ سے دو چار ہو گیا ہے اور کہیں چلا گیا ہے۔ پھر پیغام آیا کہ ان کی چھ سالہ بھانجی آئی ہوئی ہے اور اپنے گھر کو یاد کر رہی ہے پھر پیغام آیا کہ وہ چار دنوں کے لئے Holland جا رہی ہیں اس اثناء میں طلباء کی گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں کچھ چڑ سا گیا اور اپنا مضمون جو مجھے John Hopkins میں پڑھنا تھا The News on Sunday میں بھیج دیا۔

ہالینڈ سے واپسی پر ڈاکٹر عائشہ کا پیغام آیا کہ ان کے ساتھ ڈنر کروں۔ رات آٹھ بجے کا وقت طے ہوا۔ میں ٹیوب سسٹم سے ناواقفیت کی بنا پر سات بجے پہنچ گیا۔

وہاں ایک اور بہت اچھے صحافی واجد سے ملاقات ہوئی۔ نوجوان آدمی ہیں اور Discovery Channel کے لیے Free Lance کرتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے رات کے تقریباً ایک بج گئے۔ Metro بند ہو گئی۔ ایک ٹیکسی روکی۔ ڈرائیور کو تعلق اتفاق سے پاکستان سے تھا۔ کہنے لگا کہ میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ صحافی ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق لاہور سے ہے اور اس کا ایک بھائی بھی صحافی ہے۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ اس نے بتایا کہ لاہور کے اخبار The Nation میں ہے۔

رات گئے Alexedria پہنچا۔ ۳۵ ڈالر لگا۔ زلیخا بہت ناراض ہوئی۔ کہنے لگی، فون تو کر دیا ہوتا۔ ہم لوگ انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کہا تھا فون میرے پاس ہے ہی نہیں۔ سو گیا۔

(Alexendria VA July27,2010)

ایک سچا انقلابی ـــ سیّد سبط حسن

۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ میری سیّد سبط حسن سے ملاقات ہوئی۔ میں جامعہ کراچی میں شعبہ فزیالوجی (Physiology) میں بی ایس سی (آنرز) (B.Sc. Honours) میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا اور بائیں بازو کی طلباء تنظیم این ایس ایف (NSF) کا سرگرم کارکن۔

نواز بٹ نے جو کالعدم نیشنل عوامی پارٹی (National Awami Party) اور زیرِ زمین کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے کیٹرک ہال کراچی میں ادیبوں اور دانشوروں کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ سید سبطِ حسن اور فیض احمد فیض کی موجودگی نے اس تقریب میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس جلسے کے چند روز بعد میں انشورنس کمپنی ای ایف یو (EFU) کے دفتر گیا جو ٹاور کے قریب قمر ہاؤس نامی بلڈنگ میں واقع ہے۔ سبط صاحب وہاں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز (Director Public Relations) تھے۔ ایک چٹ پر میں نے اپنا نام لکھا اور چپراسی کے ذریعہ اسے سبطِ صاحب کو بھجوایا۔ انہوں نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلوالیا۔ میں نے اپنا تعارف کراویا اور تجویز پیش کی کہ ہم غریب علاقوں میں ادیبوں اور دانشوروں کے چھوٹے چھوٹے جلسے منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ سبطِ صاحب نے تجویز فوراً ہی منظور کرلی۔

میں اس زمانے میں نچلے متوسط طبقے کی بستی لیاقت آباد میں رہا کرتا تھا۔ ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ پہلا جلسہ وہیں منعقد ہونا چاہیے۔ نواز بٹ جو ہم سے سینئر

تھے ڈپٹی کمشنر سے سی ون ایریا (C-1 Area) لیاقت آباد میں جلسہ منعقد کرنے کی اجازت لے آئے۔ وہیں میرا گھر تھا۔ چونکہ ڈیکوریشن والا ہمارے کاز سے ہمدردی رکھتا تھا لہٰذا رعائتی داموں پر ہمیں ۱۰۰ عدد کرسیاں، ایک مائیکروفون اور ایک طاقت ور بلب مل گیا۔ میں اپنے گھر کی ڈائننگ ٹیبل اُٹھا لایا جس سے اسٹیج بن گیا۔ ہدایت سیرس (Siris) کے تناور اور خوبصورت درخت پر چڑھ لیا۔ اس طرح ایک بینر جو ہم لوگوں نے بنوایا تھا عین سڑک پر آویزاں ہوگیا تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ قریب ہی شام کے وقت جلسہ منعقد ہو رہا ہے۔

وہ ایک گرم شام تھی جب میں سبطِ صاحب کے ہمراہ ان کی مزدا کار میں جلسہ گاہ پہنچا۔ تو انہوں نے پوچھا

"یہ آپ کہاں لے آئے ہیں؟"

غالباً اُن کا خیال تھا کہ جلسہ کسی گھر میں منعقد ہوگا۔

مقررین میں سیّد سبطِ حسن، میرے ماموں پروفیسر مجتبیٰ حسین، کمیونسٹ لیڈر انیس ہاشمی، ڈاکٹر عبدالحیٔ بلوچ جو اس زمانے میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے صدر اور ڈاؤ میڈیکل کالج میں سالِ چہارم کے طالب علم تھے، شامل تھے۔ اس کے علاوہ فلسطینی تنظیم (Popular Front for Liberation of Palestine) کے رہنما مصطفیٰ ترابی بھی مقررین میں شامل تھے۔ ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر ممتاز حسین کو بھی ہم نے مدعو کیا تھا، لیکن وہ اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے۔ جلسہ پر صرف ۶۰/ روپے خرچ ہوئے۔

سامعین میں زیادہ تر مقامی لوگ شامل تھے جن کا ادب سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ایک صاحب تو بغیر کسی جھجک دھوتی اور بنیان میں براجمان تھے۔

لیاقت آباد میں ہونے والا یہ چھوٹا سا جلسہ میرے اور سبطِ صاحب کے

درمیان اور بھی خوشگوار اور طویل دوستی کا رشتہ بن گیا۔ میں ان کے قریب آ گیا اور اکثر ان سے ملنے چلا جاتا۔ اس زمانے میں وہ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی میں رہتے تھے۔ ان کا کرائے کا گھر سویت محکمہ اطلاعات (Soviet Press & Information Department) کے سامنے واقع تھا جہاں اب ایوانِ دوستی (Friendship House) واقع ہے۔ یہی وہ گھر تھا جہاں میری سبطِ صاحب کے دیرینہ رفیق اور ممتاز آرٹسٹ پروفیسر شاکر علی سے ملاقات ہوئی۔

سبطِ صاحب تھے تو شادی شدہ لیکن اکیلے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ایک اسٹڈی سرکل بنانے کی تجویز پیش کی تو وہ اپنے گھر سے ہمارے دوست افسر نقوی کے گھر ناظم آباد آتے اور باقاعدہ نوٹس بنا کر لاتے۔ غالباً اس زمانے میں وہ اپنی مشہور تصنیف ''موسیٰ سے مارکس تک' کی تیاری کر رہے تھے۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں فوج کشی جاری تھی کہ جنرل یحییٰ کی حکومت نے اعلان کیا کہ پاکستان میں ایرانی سلطنت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن شہنشاہیت منایا جائے گا۔ کمیونسٹ پارٹی میں پروفیسر جمال الدین نقوی ہمارے گروپ لیڈر تھے۔ میں Candidate Member تھا۔ میں نے میٹنگ میں کہا کہ اسلام میں شہنشاہیت کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں جنرل یحییٰ کے خلاف ایک پمفلٹ نکالنا چاہیے۔ بولے ''تم ہی لکھ ڈالو!'' میں پھولا نہیں سمایا اور جیسا تیسا ایک پمفلٹ لکھ ڈالا۔ پمفلٹ تقسیم ہو گیا اور میں گرفتار ہو گیا۔ جنگ اخبار میں خبر چھپی ''یونیورسٹی کے ایک صاحبزادے گرفتار!'' ہمارے اور بھی بہت سے ساتھی گرفتار ہو گئے۔ بہت سے پہلے ہی جیل میں موجود تھے جو کیٹرک ہال میں ہونے والے ایک احتجاجی جلسے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے جو مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں فوج کشی کی ضمن میں منعقد ہوا تھا۔

سبطِ صاحب نے ہمارا اسٹڈی سرکل فوری طور پر منقطع کر دیا اس خدشہ کے

تحت کہ اور لوگ بھی گرفتار نہ ہو جائیں۔

۱۹۷۲ء میں میری رہائی عمل میں آئی جب پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مسند اقتدار سنبھالی۔

۱۹۷۲ء میں جب این ایس ایف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی تو میں نے دوستوں کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ نوجوان ادیبوں کی ایک جماعت بنائی ہے۔ ہمارے رہنما ڈاکٹر قمر عباس ندیم تھے جو ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے کہانی نویس بھی تھے۔ اُن کے صلاح مشورے سے ینگ رائٹرز فورم (Young Writers Forum) وجود میں آئی۔ سبطِ صاحب ہماری حوصلہ افزائی کرتے اور ہمیشہ مدد کے لیے تیار رہتے۔

ہم نے ینگ رائٹرز فورم کے پلیٹ فارم سے بعض بہت اچھی تقریبات منعقد کیں۔ ان میں چلی کے ممتاز شاعر پابلونرودا (Pablo Neruda) اور مقتول صدر آئندے (Salvador Allende) کی یاد میں ایک جلسہ بھی شامل تھا جو تھیوسوفیکل ہال میں منعقد ہوا۔ اس کی کارروائی ماسکو ریڈیو نے بھی نشر کیں۔ اسی طرح ہم نے کیٹرک ہال میں ''کل پاکستان مشاعرہ'' کیا جس میں فیض احمد فیض، حبیب جالب، منیر نیازی، سرور بارہ بنکوی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی اور فہمیدہ ریاض وغیرہ نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ ''یومِ مئی'' کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔

ہم غالب لائبریری میں بھی نشستیں کرتے جس کے کرتا دھرتا مرزا ظفر الحسن تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے ہمیں نشستیں منعقد کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایسی ہی ایک تقریب میں ہم نے ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، عصمت چغتائی کی پذیرائی کی۔ فیض صاحب اور سبطِ صاحب بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ ینگ رائٹرز فورم کے زیر اہتمام جب ہم

نے مکسم گورکی کی یاد میں جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو مدعو کرنے کے لئے بے چین ہوا جنہوں نے ''ماں'' کا ترجمہ کیا تھا تو سبطِ صاحب نے اپنے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر ایک جملہ لکھا ''اختر، یہ نوجوان ادیب ہیں، ان کی مدد ضرور کرو۔'' اور مجھے تاکید کی کہ ڈاکٹر رائے پوری کے پاس جاؤ جو اس زمانے میں پی ای سی ایچ ایس میں رہتے تھے۔ جب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے گھر گیا تو وہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے ''ہاں میں گورکی کو بڑا ادیب سمجھتا ہوں!'' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہمارے جلسے میں آئے اور ہم نے گورکی کی فلم (Mother) بھی دکھائی۔

سبطِ صاحب نوجوانوں سے محبت کرتے تھے اور انہیں سے توانائی حاصل کرتے۔ وہ تمام خوبصورت چیزوں سے محبت کرتے تھے جن میں عورت، ادب، شاعری، موسیقی وغیرہ شامل تھی۔ وہ کرکٹ کے شوقین تھے اور اپنے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پر کرکٹ میچز بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ وہ ٹینس کے کھلاڑی رہ چکے تھے اور اچھے پیراک بھی تھے۔

۱۹۷۴ء میں جب میں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ممتاز رہنما اجے گھوش کی کتاب میں ''بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی'' کے عنوان سے ایک باب پڑھا تو میں بے چین ہو گیا کہ اس کا اُردو ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی اور باب کا عنوان تھا "Bhagat Sindh and his Comrades"۔ خوش قسمتی سے ہمارے دوست جاوید مشتاق کو جو اب امریکہ میں رہتے ہیں اس کا ایک نسخہ ہاتھ آ گیا جو اُردو میں تھا اور ہندوستان میں طبع ہوا تھا۔ میں سبطِ صاحب کے پاس گیا اور درخواست کی کہ اس کا دیباچہ لکھ دیں۔ اوّل انہوں نے صاف منع کر دیا اور کہا وہ بھگت سنگھ کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کے پُرزور اصرار پر انہوں

نے نہایت ہی خوبصورت دیباچہ لکھا جس سے کتاب کی شان اور بڑھ گئی۔

یہ کتابچہ ہمارے سینئر دوست ملک نورانی نے جو مکتبہ دانیال کے مالک تھے اور ہماری سرپرستی کرتے تھے بغیر منافع لیے شائع کردیا۔ ۱۰۰۰ کاپیوں کی اشاعت پر صرف ۸۰۰ روپے خرچ ہوئے۔ ہمارے آرٹسٹ دوست باشام نے بغیر منافع لیے اس کا سرورق بنا دیا اور پروف ریڈنگ جاوید مشتاق نے کی۔ بعد میں اس کا سندھی زبان میں بھی ترجمہ ہوا۔

سبطِ صاحب نے ''پاکستانی ادب'' کے نام سے ایک جریدے کا بھی اجرا کیا جس کی ایڈیٹر ہماری دوست سعیدہ گزدر تھیں۔ جب اس کا ''امریکی ادب نمبر'' شائع ہوا تو اس کے لیے انہوں نے مجھ سے ''سی آئی اے'' پر ایک مضمون لکھوایا جو ہمارے دوست احفاظ الرحمٰن نے روزنامہ ''مساوات'' میں Full Page شائع کیا۔

دقیانوسی کمیونسٹوں کے برخلاف سبطِ صاحب بہت روشن خیال تھے اور نئے خیالات و افکار کا ہمیشہ خیرمقدم کرتے تھے۔ وہ جم کر کام کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے لیکن ہمیشہ منکسرالمزاج رہے۔ وہ ایک سچے انقلابی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بانی سیّد سجاد ظہیر کا حوالہ دے کر وہ کہتے ''انقلاب وائیلن بجانے کے مانند ہے۔'' ان میں حسنِ ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک مرتبہ میں ان کے دفتر گیا تو وہاں ممتاز کمیونسٹ رہنما، دانشور اور صحافی ایرک سپرئین (Eric Cyprian) بیٹھے ہوئے تھے۔ سبطِ صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ بجے دوپہر ہم تینوں ان کے گھر واقع گلشن اقبال آگئے جہاں ہم نے کھانا کھایا۔

ایرک سپرین اس زمانے میں ۶۵ سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ وہ سبطِ صاحب سے بولے کہ انہوں نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ سبطِ

صاحب مسکرا کر بولے "Very Fertile" اور اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ وہ ڈسپلن کے سخت عادی تھے۔

ایک دفعہ میں ان کے گھر گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت دی لیکن میں نے شائستگی سے منع کر دیا اور بتایا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ کہنے لگے ''میں تو روز اکیلا کھانا کھاتا ہوں آپ کھالیں۔'' مجھے بہت صدمہ ہوا۔ ہمارا یہ عظیم دانشور کتنا تنہا تھا!

سبطِ صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تاریخ میں ماسٹرز کیا اور کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں بھی تعلیم حاصل کی۔ ممتاز امریکی دانشور اور تحلیل نفسی کا ماہر ایرک فرام (Erich Fromm) انہیں اپنی کتابیں بھیجتا تھا۔

وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی پولٹ بیورو (Polit Bureau) کے ممبر تھے اور انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہ بیروزگار بھی رہے لیکن شکوہ کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ۲۰/اپریل ۱۹۸۶ء کو دِلّی میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا جہاں وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔

سبطِ صاحب کی موت پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کے لیے بلاشبہ بہت بڑا نقصان ہے۔

(۲۰/اپریل ۲۰۱۱ء)

ممتاز نورانی

کراچی میں کچھ جگہیں ایسی ہیں جو صحیح معنوں میں تاریخی ہیں اور جن سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ ایسی ہی ایک جگہ کلب روڈ پر واقع قصرِ زینب کا اپارٹمنٹ نمبر۲ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ایک باوقار اور محبت کرنے والی خاتون ممتاز نورانی اور ان کے بزلہ سنج شوہر ملک نورانی رہا کرتے تھے۔ ممتاز نورانی انجمن جمہوریت پسند خواتین (Democratic Women's Association) کی کراچی کی صدر تھیں۔ ان کا اپارٹمنٹ طالب علموں، دانشوروں، سیاسی کارکنوں، شاعروں اور صحافیوں کی مستقل آماجگاہ تھا۔

میں بھی وہاں جایا کرتا۔ ممتاز نورانی بہت محبت سے ہمارے لیے کھانا پکاتیں اور ہم اکثر اُن کے ڈرائنگ روم میں زہرہ نگاہ کی ٹیپ رکارڈ کی ہوئی شاعری سے لطف اندوز ہوتے۔ اُن کے شوہر ملک نورانی اپنی خواب گاہ میں جلدی چلے جاتے لیکن ہم لوگ رات گئے تک ڈرائنگ روم میں ممتاز نورانی سے باتیں کرتے۔ وہ ہمارے لیے چائے بناتیں اور اکثر ہم وہیں قالین پر سو جاتے۔

ممتاز نورانی اکثر ہمیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سجاد ظہیر کے قصے سناتیں جنہیں وہ بمبئی (اب ممبئی) سے جانتی تھیں۔ کمیونسٹ رہنما حسن ناصر جنہیں لاہور کے بدنام زمانہ شاہی قلعہ میں ۱۹۶۰ء میں تشدد اور ایذا رسانی کے ذریعہ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا، نورانیوں کے قریبی دوست تھے۔ وہ ہمیں اُن کی شائستگی اور کمیونسٹ کاز سے لگاؤ (Commitment) کے بارے میں بھی بتاتیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں قصرِ زینب پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء میں گیا جب ہم لوگوں نے ینگ رائٹرز فورم (Young Writers Forum) کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا بیٹا دانیال نورانی بھی ینگ رائٹرز فورم کے بانیوں میں سے تھا اور اس زمانے میں بی کام (B.Com.) کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور میرا اپنے والدین ممتاز نورانی اور ملک نورانی سے تعارف کرایا۔ ملک نورانی مشہور پبلشر تھے اور مکتبہ دانیال کے مالک۔ وہ بڑے اہتمام سے اُردو کی بڑی اچھی کتابیں شائع کرتے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے ممتاز نورانی کی ذاتی لائبریری سے مشہور اداکار بلراج ساہنی کی سوانح عمری پڑھی۔قصرِ زینب ہی کے اس اپارٹمنٹ میں میری ملاقات اُردو کے ممتاز شاعر کیفی اعظمی سے ہوئی جب وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پاکستان آئے۔ یہیں میری ملاقات ممتاز کمیونسٹ رہنما اور دانشور سوبھو گیان چندانی سے بھی ہوئی۔

ممتاز مؤرخ اور دانشور سبطِ حسن جو ممتاز نورانی کو محبت سے ''ممتاز بہن'' کہتے اکثر قصرِ زینب آتے۔ ممتاز شاعرہ فہمیدہ ریاض، پروفیسر ذکیہ سرور، ممتاز ماہر نفسیات پروفیسر ہارون احمد اور کمیونسٹ رہنما پروفیسر جمال الدین نقوی بھی اُن کے گھر اکثر آتے۔قصرِ زینب ہی کے اس پارٹمنٹ میں میری ملاقات ممتاز صحافی اور کہانی نویس حمید اختر سے بھی ہوئی۔

درحقیقت قصرِ زینب کا یہ اپارٹمنٹ تمام لبرل اور ترقی پسند لوگوں کا گھر تھا۔ اس کی چھت تلے امن و آشتی کے قیام اور Civil Liberties اور خواتین کے حقوق کے لیے بہت سے منصوبے بنے اور اُن پر عمل درآمد بھی ہوا۔

ممتاز نورانی سب ہی لوگوں کو متاثر کرتی تھیں۔ اُن کی شفقت تمام لوگوں، خاص طور پر نوجوانوں کا دل موہ لیتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں اپنے دوست اور

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (Sindh National Students Federation) کے سابق جنرل سیکریٹری میر تھیبو کو ممتاز نورانی سے ملانے لے گیا۔ ہم لوگ پریس کلب میں بیٹھے تھے۔ میں نے میر سے کہا چلو تمہیں گھر کا کھانا کھلاتے ہیں۔ میر نے سیاست چھوڑ دی تھی اور ممتاز نورانی کا اصرار تھا کہ دوبارہ سیاست میں سرگرم ہو جاؤ۔ میر نے مذاق میں کہا کہ اگر وہ اس کے گاؤں مہڑ جائیں گی جو دادو ضلع میں واقع ہے تو وہ دوبارہ سیاست میں سرگرم ہو جائے گا۔ ممتاز نورانی اس کے ساتھ مہڑ چلی گئیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ وہ کتنی سادہ ہیں اور ترقی پسند تحریک سے ان کا لگاؤ کتنا گہرا ہے۔

آج ممتاز نورانی اور ملک نورانی ہمارے درمیان موجود نہیں۔ ۱۹۹۹ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ ملک نورانی کا انتقال ۱۹۸۷ء میں سرطان سے ہوا تھا۔ لیکن ان کی بیٹی حوری نورانی نے مکتبہ دانیال کو سنبھال لیا ہے اور بڑی اچھی اچھی ادبی کتابیں شائع کرتی ہیں جبکہ نورانی صاحب کی دوسری اشاعت گاہ پاکستان لاء ہاؤس (Pakistan Law House) اُن کے بڑے بیٹے کامران نورانی نے سنبھال لی ہے۔

حوری نے قصرِ زینب کے اپارٹمنٹ نمبر۲ کو کوئی بارہ سال پہلے خیرباد کہہ دیا ہے اور وہ دوسری جگہ منتقل ہو گئی ہیں لیکن قصرِ زینب کے اس اپارٹمنٹ کی یادیں لبرل اور ترقی پسند لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ جاگتی رہیں گی کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے متعدد تحریکیں چلیں۔

سلیم عاصمی

۱۹۹۰ء میں جب میں ڈیلی نیوز (Daily News) میں بحیثیت سینئر رپورٹر اور انچارج کامرس پیج (Commerce Page) کام کر رہا تھا تو میری طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ میں ضرورت سے زیادہ متحرک ہوگیا۔ خبروں کے علاوہ سٹی اور کامرس کے صفحات کے لیے انٹرویوز بھی کر رہا تھا۔ دن بھر مارا مارا پھرتا۔

ایک دن جناح اسپتال گیا اور ڈاکٹر ہارون کا انٹرویو کرنے کے بعد جانے لگا تو وہ بولے ''کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''یہاں آیا ہوں تو ڈاکٹر جعفر نقوی کا بھی انٹرویو کرلوں۔''

کہنے لگے ''ان کی تو ایک Kidney (گردہ) نہیں ہے۔''

مجھے بہت تعجب ہوا کہ Urology Department کے سربراہ کا ایک گردہ نہیں ہے لیکن سنا تھا کہ بعض لوگوں کا ایک ہی گردہ ہوتا ہے۔

بہرحال ان کا انٹرویو کیا۔ شام کے وقت ڈاکٹر مظہر حیدر سے پوچھا کہ ڈاکٹر جعفر نقوی کا صرف ایک ہی گردہ ہے؟ وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے اور بولے کہ دونوں کنپٹیوں کے پاس گردہ کی شکل کے دو Lobes ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون کا اشارہ ان کی طرف تھا۔

ڈاکٹر ہارون کا ڈیلی نیوز میں نمایاں طور پر انٹرویو شائع ہوا۔ مظہر عباس جو اُن دنوں ''دی اسٹار'' (The Star) میں کام کرتا تھا بولا ''یہ اچھا ہے۔ انٹرویو بھی کرلیا

اور دوا بھی لے لی۔''

اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ بے چینی بڑھتی گئی۔

اس اثناء میں کراچی پریس کلب کے انتخابات کا مرحلہ آ گیا۔ سلیم عاصمی کراچی نئے نئے آئے تھے۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا ان کا تعلق بڑے گھرانے سے ہے مگر ان کے رینک (Rank) کا پتہ نہیں۔ عاصمی صاحب اس زمانے میں کچھ تھے بھی بھاری بھرکم۔ میں نے اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ میں تھا کہ سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ اب سلیم عاصمی مجھے سمجھا رہے ہیں کہ وہ ''پاکستان ٹائمز'' میں تھے، ''دی مسلم'' میں تھے لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

انتخابات کا دن آ گیا۔ ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی۔ سلیم عاصمی نے مجھ سے کہا کہ اوپر جاؤ اور میری طرف سے Counting میں بیٹھو۔ میں اوپر جا کر بیٹھ گیا اور وہیں تھوڑی دیر میں سو گیا۔ پھر بھی سلیم عاصمی انتخابات جیت گئے۔

(۱۶/اکتوبر ۲۰۱۰ء، کراچی)

انور احسن صدیقی

یوں تو انور احسن صدیقی سے غائبانہ تعارف ایک زمانے سے تھا لیکن ان سے باقاعدہ تعارف جولائی 1973ء میں ہوا جب میں نے سوویت محکمہ اطلاعات میں نوکری کی۔

سوویت محکمہ اطلاعات کے دو شعبے تھے، ایک پریس سیکشن جس میں نیوز بلیٹن اور فیچر وغیرہ تیار ہوتے تھے، دوسرا میگزین سیکشن جہاں سے ماہ نامہ ''طلوع'' شائع ہوتا تھا۔ انور احسن صدیقی ماہ نامہ ''طلوع'' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ بہت خوبصورت میگزین تھا اور اس کی قیمت فقط آٹھ آنے (نصف روپیہ) تھی۔ انور احسن صدیقی اس کا ترجمہ تقریباً خود ہی کرتے تھے۔

مجھے بحیثیت مترجم رکھا گیا تھا لیکن اس وقت کے قونصل بلینوف کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ تھا۔ اس نے ایک (Creative Cell) قائم کیا جس میں کل تین افراد تھے۔ ایک میں، دوسرے مرحوم عنایت کاشمیری اور تیسرے سندھی کے معروف ادیب منیر ملک وہ بھی ہمیں چھوڑ گئے۔ کچھ دنوں تک مہ ناز رحمٰن نے بھی ہمارے ساتھ کام کیا۔

ہم سوویت محکمہ خارجہ کی پالیسی ذہن میں رکھ کر مضامین لکھتے اور یہ مضامین اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔

بلینوف ہفت روزہ ''الفتح'' کی کور اسٹوری بن گیا تھا۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور مارکسی فلسفہ پر دو ضخیم کتابیں دیں اور کہا مجھے بتاؤ دونوں میں سے کون سی بہتر ہے اور کس کا اُردو ترجمہ ہونا چاہیے۔ میں پھولا نہیں سمایا کہ مجھے اتنی اہمیت دی جارہی ہے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی پڑھانے کا ایک انداز تھا۔

ان دونوں کتابوں میں سے ایک سوویت یونین کے سب سے بڑے اخبار "PRAVDA" کے چیف ایڈیٹر Afanasyev کی تصنیف تھی۔ میں نے کہا یہ کتاب زیادہ اچھی ہے۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے گا اور انور احسن صدیقی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ اس کا ترجمہ کریں۔

میں اکثر ان کے کمرے میں چلا جاتا اور دیکھتا وہ کس انہاک سے اس کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ انہیں اُردو اور فارسی پر دسترس حاصل تھی لیکن انہیں کسی لفظ کے بارے میں شبہ ہوتا تو وہ ڈاکٹر اسلم فرخی اور پروفیسر ممتاز حسین کو فون کرتے اور ان سے پوچھتے کہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ کیا ہونا چاہیے۔

ماسکو کے غیر ملکی اشاعت گھر سے لاکھوں کتابیں شائع ہوئیں لیکن انور احسن صدیقی نے جو ترجمہ کیا اس جیسا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

وہ بہت سنجیدہ اور کم گو آدمی تھے۔ لیکن دھن کے پکے۔ مجھے علم تھا کہ زمانہ طالب علمی میں بھی انہوں نے کراچی کی طلبہ تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن میں نے ان کی زبان سے خودستائشی کبھی نہیں دیکھی۔

اُن کا کھانا بھی بہت مختصر ہوتا تھا۔ لنچ آورز میں وہ اور ان کی بیگم ریحانہ جو لائبریری سیکشن میں کام کرتی تھیں، آجاتیں اور دونوں میاں بیوی خاموشی سے لنچ کرتے۔

پروفیسر سحر انصاری کا کہنا ہے کہ اگر انور احسن صدیقی کراچی یونیورسٹی میں

درس و تدریس سے متعلق ہوتے تو بہت پہلے وائس چانسلر بنتے لیکن انہوں نے سوویت محکمہ اطلاعات میں نوکری کرنا پسند کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتراکی خیالات کے حامل افراد کا کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور اس سے قبل اے بی اے حلیم نے دانہ پانی بند کیا ہوا تھا۔ جب کنور محمد اشرف جیسے جیّد مؤرخ کو یہاں نوکری نہیں ملی تو انور احسن صدیقی کا گزارہ کیسے ہوتا؟

(کراچی ۲۲/اگست ۲۰۱۲ء)

لال بخش رِند

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ لال بخش رِند سے کب اور کیسے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میں اکثر اُن کے گھر جو لیاری میں واقع تھا چلا جاتا۔ لوگ انہیں پیار سے لالہ کہتے تھے۔ وہ لی مارکیٹ کے ایک پرانے گھر نبی بخش منزل میں رہتے تھے جس کے قریب ہی ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) کا دفتر تھا۔

یہاں بلوچ اور غیر بلوچ نوجوان اکٹھا ہوتے اور ایوبی آمریت کے خلاف منصوبے بناتے۔ لالہ کی دل آویز شخصیت تمام نوجوانوں کے لیے بہت جاذبیت رکھتی تھی۔ اُن کا قد سوا چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا اور اپنی نوجوانی میں وہ لائٹ ویٹ باکسر اور فٹ بالر بھی رہے تھے۔ سرخ و سفید چہرہ اور دل کو موہ لینے والی باتیں۔ وہ ہم اُردو بولنے والوں کو اکثر مذاق میں دال خور کہتے حالانکہ عصبیت انہیں چھوکر بھی نہیں گزری تھی۔

وہ کبھی کبھی میرے گھر بھی آجاتے میں اُن دنوں لیاقت آباد میں رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُن سے میری ملاقات ہدایت نے کروائی تھی۔ آخری دم تک وہ ہدایت کو یاد کرتے رہے۔

لالہ لیاری میں بہت مقبول تھے۔ ان کے کمرے میں صرف سیاسی کارکنوں کا جمگھٹا نہیں رہتا تھا بلکہ لیاری کے انتہائی غریب بھیل اور میگواڑ بھی وہاں جمع رہتے۔ وہ اُن کے ساتھ چائے پیتے اور کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا کھاتے۔ وہ صرف سیاسی

لیڈر نہیں تھے بلکہ عمدہ قسم کے سماجی کارکن بھی تھے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب فوجی آمر ایوب خان نے منصوبہ بنایا کہ لیاری کے لوگوں کو بے دخل کر دیا جائے اور پورٹ سے قریب اس انتہائی قیمتی زمین کو صنعت کاروں کو دے دیا جائے تو لالہ کی قیادت میں لیاری کے لوگوں نے ایک موثر تحریک چلائی۔ لیاری کے لوگ ہمیشہ سے فٹ بال، باکسنگ اور سائیکل سواری کے شوقین رہے ہیں۔ موسیقی اُن کے رگوں میں بستی ہے اور یہ دل کے بہت سادہ ہیں۔ لالہ اور اُن کے ساتھی فٹ بال کے میدانوں، مسجدوں وغیرہ میں جاتے اور کارنر میٹنگ کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ ایک سازش کے تحت انہیں اُن کے علاقے سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس تحریک میں عورتیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ جو ہمیشہ سے بہت دبنگ رہی ہیں۔ آمر ایوب کو پیچھے ہٹنا پڑا اور لیاری کی بے دخلی کی تحریک ناکام ہوگئی۔

لاس انجیلز ٹائمز (Los Angeles Times) کے اس وقت کے ٹوکیو کے بیورو چیف (اب فارن اڈیٹر) بروس ولیس (Bruce Wallace) کو انٹرویو دیتے ہوئے لالہ نے کہا کہ لیاری میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب ذوالفقار علی بھٹو نے وہاں کے لوگوں کو حقِ ملکیت (Lease) دی۔ انہوں نے بتایا کہ اس سلسلہ میں تحریک تو لالہ اور اُن کے رفیقوں نے چلائی تھی لیکن پھل پیپلز پارٹی کو ملا۔ اس انٹرویو کے اقتباسات لاس انجلز ٹائمز میں ۳ دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ یہ انٹرویو میں نے ہی کروایا۔

ہوا یہ تھا کہ بُروس پاکستان آیا ہوا تھا اور پیپلز پارٹی پر ایک اسٹوری کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ بطورِ فکسر (Fixer) کام کر رہا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اگر پیپلز پارٹی پر اسٹوری کرنی ہے تو اس کا آغاز لیاری سے کرو جہاں یہ پارٹی بہت مقبول ہے۔ بُروس بولا ?Is it safe (کیا وہاں جانا محفوظ ہے؟) میں نے کہا صحافی

کے لیے کوئی علاقہ بھی خطرے سے خالی نہیں۔تم میریٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ یہاں بھی بم دھماکہ ہو چکا ہے۔ بُروس تیار ہوگیا اور ہم لیاری چلے گئے جہاں ہم نے نہ صرف لالہ کا انٹرویو کیا بلکہ تمام علاقہ اچھی طرح دیکھا اور بہت سے لوگوں سے باتیں کیں۔

لالہ نے Narandas Anaraji Bechaar School سے پرائمری اسکول کی تعلیم حاصل کی جس کے بعد انہوں نے لیاری ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے تو کسی لڑکے سے اُن کا جھگڑا ہوگیا اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔اس کے بعد جیل گویا اُن کا دوسرا گھر بن گیا۔

''مجھے یاد نہیں کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے میں کتنی مرتبہ گرفتار ہوا ہوں۔'' انٹرویو میں انہوں نے مجھے بتایا۔ انہوں نے ایوبی آمریت کے خلاف اور ون یونٹ کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ نیشنل عوامی پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے بھی وابستہ رہے جو اس زمانے میں زیر زمین تھی۔

''دو ہندو کارکنوں میوارام اور گنگا رام نے جو بعد میں ہندوستان ہجرت کر گئے مجھے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ آیا یہ درست ہے کہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے تو انہوں نے کہا کہ ہم استحصال کرنے والوں کے سوا سب کو مانتے ہیں۔'' لالہ نے انٹرویو میں بتایا۔ یہ انٹرویو دی نیوز (The News) اخبار میں ۱۸ ستمبر ۲۰۰۷ء کو شائع ہوا۔

ممتاز مورخ اور دانشور سید سبطِ حسن اور ممتاز کمیونسٹ رہنما، دانشور اور کہانی نویس سوبھوگیان چندانی نے لالہ کو بہت متاثر کیا۔ وہ فیض احمد فیض سے بھی متاثر تھے۔ وہ روسی ناول نگار میکسم گورکی اور میخائل شولوخوف کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے ورثہ میں جو لائبریری چھوڑی ہے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ

انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔

۱۹۷۱ء میں لالہ کی گرفتاری دوبارہ عمل میں آئی جب انہوں نے مشرقی پاکستان میں ہونے والی قتل و غارت گری کے خلاف آواز اٹھائی۔

''لیاری ہمیشہ سے ایک ایسا علاقہ رہا ہے جہاں بلوچ، سندھی، کچھی، مہاجر، پٹھان اور پنجابی مل جل کر رہتے رہے ہیں۔ لیکن پچھلی افغان جنگ کے بعد یہاں خطرناک ہتھیاروں اور ہیروئن کو متعارف کرایا گیا اور آج اسی لیاری کا تشخص گینگ وار (Gang War) ہوگیا ہے۔'' لالہ نے بتایا۔

جب ۱۹۷۲ء میں بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت بنی تو لالہ نے کوئٹہ سے ایک جریدے ''سنگت'' کا بھی اجرا کیا جس کے اڈیٹر رؤف وارثی تھے۔ انہوں نے مسلح جدوجہد میں بھی حصہ لیا جب نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت کو ایک سازش کے ذریعہ ختم کیا گیا۔

''بلوچ نوجوانوں نے گوریلا لیڈر شیر محمد مری کی قیادت میں مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ میں بھی اس میں شامل تھا لیکن شیر محمد مری کا فلسفہ میری سمجھ سے باہر تھا۔'' لالہ نے بتایا۔

جنرل ضیاء کے زمانے میں وہ میرے گھر کے قریب بلوچ پاڑے میں روپوش تھے۔ میں اُن سے ملنے تقریباً روز ہی جاتا اور اکثر کھانا بھی اُن کے ساتھ کھاتا۔ ایک دن کچھ پٹھان لڑکے اُن سے ملنے آئے اور اس کے بعد گرفتار ہوگئے۔ میں نے لالہ سے کہا بہتر ہوگا کہ وہ یہ جگہ چھوڑ دیں لیکن وہ بڑے لاپرواہ بھی تھے۔ اُن لڑکوں میں سے کوئی ایک تشدد برداشت نہ کرسکا اور اس نے لالہ کے ٹھکانے کے بارے میں بتادیا۔ نتیجتاً وہ گرفتار ہوگئے اور اُن پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا۔

''ایک مرتبہ بھٹو نے غوث بخش بزنجو سے شکایت کی کہ میں شرپسند ہوں اور

وہ مجھے دیکھ لیں گے۔ بزنجو نے بھٹو کو جواب دیا کہ اگر رِند کو نقصان پہنچا تو بلوچستان میں پیپلز پارٹی کا کوئی بھی کارکن نہیں رہ سکے گا۔ اس جواب سے بھٹو مشتعل ہو گئے۔"

لالہ نے بتایا: "ایک دفعہ مجھے ایک مہینہ میں پانچ مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ بیرسٹر عزیز شیخ میری ضمانت کراتے لیکن جوں ہی میں جیل سے باہر آتا مجھے پھر گرفتار کرلیا جاتا۔ ایک دفعہ تو یہ ہوا کہ میں نے ضمانت ہوجانے کے باوجود جیل سے نکلنے سے انکار کردیا لیکن جیلر نے مجھ سے درخواست کی کہ میں باہر چلا جاؤں۔" لالہ بولے۔

۱۹۶۲ء میں اُن کی شادی ہوئی۔ اُن کی ایک بیٹی ہے۔ وہ اپنے بھائی حنیف رِند کا بڑی محبت سے ذکر کرتے جو اس زمانے میں جب وہ جیل میں ہوتے تھے، اُن کے خاندان کی سیوا کرتے۔

(کراچی، ۱۹/اگست ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر قمر عباس ندیم

یادیں امڈی چلی آرہی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں جب میں نے بائیں بازو کی تنظیم این ایس ایف (NSF) سے اپنا رشتہ جوڑا تو قمر عباس ندیم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈاکٹر بن چکے تھے اور اس زمانے میں رضویہ سوسائٹی میں رہتے تھے۔ لکھنو سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ ایک خوبرو، شائستہ اور انتہائی حساس شخص تھے۔

ہماری گہری دوستی ہوگئی۔ وہ ہمیں اکثر ناظم آباد چورنگی پر واقع ''کیفے ذائقہ'' لے جاتے اور خاطر مدارات کرتے۔ وہ اُن طالب علموں میں سے تھے جنہوں نے ہمیشہ ۷۰ فیصد سے زیادہ مارکس حاصل کئے۔ وہ ایک اچھے ڈاکٹر کے علاوہ بہت اچھے کہانی نویس بھی تھے۔

اُن کی والدہ نے جو باپردہ خاتون تھیں انہیں بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اُن کے دو ماموں بھی اُن کے ساتھ رہتے تھے۔

اُن دنوں میں لیاقت آباد میں رہتا تھا اور اکثر اُن کے گھر پیدل چلا جاتا۔ قریب ہی عثمانیہ کالونی تھی جہاں مجاہد رہتا تھا۔ وہ بھی وہاں آجاتا۔

یوں تو قمر کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا لیکن ڈاکٹر مظہر حیدر اور ڈاکٹر محمود اُن کے بہت قریبی دوست تھے۔ اُن کا ڈرائنگ روم ادبی لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ سیاسی سطح پر وہ ڈاکٹر شیر افضل کے مداح تھے۔

اشفاق حسین اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی سے اُن ہی کے گھر ملاقات ہوئی۔ این ایس ایف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہی تھی۔ ایک دن میں نے تجویز پیش کی کہ نوجوان ادیبوں کی ایک تنظیم بناتے ہیں تاکہ این ایس ایف کے بکھرے ہوئے لوگ اس کے

سائے تلے اکٹھا رہیں۔ انہوں نے تجویز فوراً منظور کرلی ۔ اس طرح ینگ رائٹرز فورم (Young Writers Forum) معرضِ وجود میں آئی۔ اس کی سرپرستی قمر عباس ندیم کرتے تھے۔ اس تنظیم کے تحت ہم نے بہت سے اچھے پروگرام کیے۔ ہماری کامیابیوں سے بعض لوگوں کو تکلیف بھی ہوئی۔ مثلاً ڈاکٹر حسّان کا خیال تھا کہ ینگ رائٹرز فورم سبطِ حسن نے شعور کند کرنے کے لیے بنائی ہے جب کہ اس کا آئیڈیا میں نے دیا تھا اور سبطِ صاحب ہماری سرپرستی کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ آئیڈیا میں نے پروفیسر جمال نقوی کو اعتماد میں لے کر دیا تھا جو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے اور ڈاکٹر حسّان کا بھی اس زمانے میں پارٹی سے تعلق تھا۔ بعد میں انہوں نے ''کمیونسٹ لیگ'' بنالی۔

۱۹۶۹ء کی جمہوری تحریک میں میں نے بحیثیت ایک طالب علم کے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ جس دن جنرل ایوب نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصّہ نہیں لیں گے تو میں خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ لیاقت آباد میں جہاں میں رہتا تھا کرفیو لگا ہوا تھا لیکن میں نے سوچا کہ اخبارات نے کوئی ضمیمہ ضرور نکالا ہوگا۔ وہ لے کر آنا چاہیے۔ میں لیاقت آباد سی ون ایریا میں رہتا تھا جہاں سے تین ہٹی صرف ایک اسٹاپ دور تھی۔ میں کرفیو میں باہر نکل گیا۔ تین ہٹی کے پُل پر فوجی کھڑے تھے۔ میں نے اُن سے کہا اپنے افسر کے پاس لے چلو۔ وہ مجھے اپنے افسر کے پاس لے گئے جو کوئی لیفٹننٹ یا کیپٹن تھا۔ میں نے کالج کا شناختی کارڈ اسے دکھایا اور کہا مجھے بہت ضروری کام سے صدر جانا ہے۔

وہ بولا ''آپ کو معلوم نہیں کہ کرفیو لگا ہوا ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے لیکن مجھے بہت ضروری کام سے صدر جانا ہے۔ اس نے اس شرط پر مجھے جانے دیا کہ واپسی پر میں لیاری ندی سے اپنے گھر جاؤں گا۔ میں نے حامی بھرلی۔

جب میں صدر پہنچا تو واقعی ضمیمہ نکلا ہوا تھا۔ میں نے وہ خریدا اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جب واپس پہنچا تو مغرب کا وقت ہوگیا تھا اور لیاری ندی میں کافی اندھیرا تھا۔اس زمانے میں ندی میں کافی پانی ہوتا تھا۔ میں نے سوچا سڑک سے ہی واپس چلتے ہیں۔ وہاں وہی فوجی افسر موجود تھا۔اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ واپس ندی سے جائیں۔ میں نے کہا کہ ندی میں پانی ہے اور اندھیرا بھی ہوگیا ہے۔ یہیں سے جانے دیں۔ وہ بولا ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرسکتے۔ میں نے کہا قانون تو آپ نے اسی وقت توڑ دیا تھا جب آپ نے مجھے صدر جانے کی اجازت دی تھی۔ غصہ سے بھپر گیا اور سپاہیوں سے بولا ''یہ کوئی سیاسی شخص لگتا ہے۔اس کا دماغ ٹھیک کرو۔''

اس کے بعد پانچ چھ فوجیوں نے میری خوب پٹائی کی اور مجھے ٹرک میں لاد کر لیاقت آباد تھانے لے گئے۔اس پٹائی کے نشانات میری پیٹھ پر ابھی تک باقی ہیں۔

تھانے میں لاک اپ (Lock Up) لڑکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سپاہی میرے پاس آیا اور حکم دیا کہ میں زمین پر بیٹھ جاؤں۔ میں نے جواب دیا میں زمین پر نہیں بیٹھوں گا۔ایک اے ایس آئی (ASI) مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ چائے پلائی ۔کوئی شریف آدمی تھا۔ پوچھا ''کہاں رہتے ہو؟'' میں نے بتایا ''سی ون ایریا میں رہتا ہوں۔'' کہنے لگا ''علی مختار رضوی کے گھر کے قریب رہتے ہو؟'' میں نے کہا۔''نہیں شروع ہی میں رہتا ہوں۔''پوچھا ''سیّد ہو؟'' میں نے کہا 'جی!' کہنے لگا ''کھوکھراپاری سیّد تو نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا ''کھوکھراپاری سید کیا ہوتا ہے؟'' بولا ''کھوکھراپار سے بارڈر کراس کیا اور سید بن گئے!''

''یہ ڈاکٹر سیّد ادیب الحسن رضوی کہیں کھوکھراپاری سیّد تو نہیں ہیں؟'' دل میں اچانک خیال آیا۔

ایک دفعہ اُن کی پریس کانفرنس میں گیا تو ''نوائے وقت'' کے بچل لغاری نے اُن سے سوال کیا کہ'' آپ جیسے شریف آدمی کو در در بھیک مانگنی پڑتی ہے۔''

بولے'' آپ سے کس نے کہا کہ میں شریف آدمی ہوں؟''

سنا ہے ۱۹۵۳ء والی ڈی ایس ایف (DSF) میں یہ اور ڈاکٹر شیر افضل کا کام یہ ہوتا تھا کہ دائیں بازو کا کوئی شخص بدمعاشی نہ کر سکے۔ یعنی بدمعاش رہے ہیں! خود ہی کہہ رہے تھے کہ شریف آدمی نہیں ہیں!

بات قمر عباس ندیم کی ہو رہی تھی۔ ذہن پتہ نہیں کہاں بھٹک گیا۔ خیر صبح کے وقت جب کرفیو کھلا تو میرے والد اور ماموں تھانے آئے اور کان پکڑ کر مجھے گھر لے گئے۔

مجھے کورنگی بھیج دیا گیا جہاں میرے ایک چچا رہتے تھے۔ اس زمانے میں کورنگی کراچی کا مضافاتی علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔

ینگ رائٹرز فورم میں ہم سب لوگوں نے دو ایک کہانیاں یا دو چار نظمیں لکھی تھیں۔ لے دے کے ایک قمر عباسِ ندیم باقاعدہ ادیب تھے۔ ان کی کتاب ''شیشے کی ابرو'' مکتبہ دانیال نے شائع کی۔

وہ روایتی ترقی پسند نہیں تھے اور قرۃ العین حیدر اُن کی پسندیدہ ناول نگار تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ وجودیت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ قنوطیت کی طرف بھی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ اُن کے گھر گیا تو بولے۔'' یہ غمِ حسین آپ چھوڑ دیں ورنہ خودکشی کر لیں گے۔''

کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ قمر عباس ندیم نے خودکشی کر لی۔

گویا جب وہ مجھے تلقین کر رہے تھے تو خود کلامی کر رہے تھے۔

(کراچی، ۲۴ر مئی ۲۰۱۲ء)

مضامین بڑے پرچوں میں شائع نہیں ہوتے جبکہ شاہد کے ہوجاتے ہیں؟

عنایت بولا کہ وہ مارکسٹ ہے جبکہ میں لبرل ہوں ۔ ڈاکٹر بیلوکریٹسکی بولا کہ مارکسزم کی ترویج و اشاعت کے لیے ماسکو میں ایک ادارہ قائم ہے جبکہ یہاں ہمارا مقصد اخبارات اور جرائد میں مضامین شائع کروانا ہے جو سوویت خارجہ پالیسی کے تناظر میں لکھے گئے ہوں۔

میں پھر بہک گیا۔ بات انور کی ہورہی تھی۔ ڈاکٹر بیلوکریٹسکی کو انور اور میں نے ایک سجاوٹ کی چیز (Decoration Piece) تحفتاً دی۔ اس نے مجھے پاکٹ سائز میں لنین کی کتابوں کا سیٹ دیا۔ وہ بھی سب بٹ گئیں۔ مجھے یاد نہیں کہ انور کو اس نے کیا تحفہ دیا۔

کھانا ہم نے ایک چینی ریستوران میں کھایا۔ انور کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ چلا گیا۔ میرا گھر دور تھا۔ ڈاکٹر بیلوکریٹسکی نے پیشکش کی کہ وہ مجھے گھر تک چھوڑ دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ میں رکشہ کرکے اپنے گھر آگیا۔

(کراچی ۱۷/جون ۲۰۱۲ء)

پاتال میں بغاوت

(منیر مانک)

''پاتال میں بغاوت'' اور بہت سی دوسری تصانیف کے خالق منیر مانک سے میری پہلی ملاقات سوویت محکمہ اطلاعات (Soviet Press & Information Department) میں ہوئی جہاں اب ''ایوانِ دوستی'' (Friendship House) قائم ہے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی دہائی تھی۔ میں اور عنایت کاشمیری پہلے سے وہاں کام کررہے تھے۔

منیر ایک انتہائی حساس لیکھک تھا اور اس کی سب سے پہلی کہانی ہندوستان میں شائع ہوئی۔ سوویت محکمہ اطلاعات میں ملازمت کے آغاز سے پہلے وہ اسکول ٹیچر تھا اور کمیونسٹ پارٹی کا ممبر۔ اس کا تعلق نوشہرو فیروز سے تھا۔

لیکن دھیرے دھیرے وہ وجودیت کی جانب محوِ سفر تھا۔ اس کی بیباک تحریروں نے سندھی ادب میں ہلچل مچادی تھی۔

سوویت محکمہ اطلاعات میں ایک "Creative Cell" قائم کیا گیا تھا جس میں تین ارکان تھے۔ عنایت کاشمیری (عنایت اسٹوری) میں اور منیر مانک۔ کچھ عرصہ کے لیے ہماری دوست مہ ناز رحمٰن نے بھی اس میں کام کیا۔ یہ سیل ایک طرح سے سوویت محکمہ اطلاعات کی China Desk تھی۔ ہمارا کام عوامی جمہوریہ چین کے بعض نظریات پر ناقدانہ نظر ڈال کر مضامین لکھنا ہوتا تھا جو اخبارات اور چھوٹے موٹے جریدوں میں شائع ہوتے۔

منیر کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا کیونکہ وہ نہ صرف ون یونٹ (One Unit) کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے چکا تھا بلکہ بحیثیت ادیب بھی اس کا بڑا مقام تھا۔

لیکن وہ بہت دباؤ میں رہتا تھا۔ میں اکثر اس کو چھیڑتا کہ اس کا Brain Haemorrage ہو جائے گا۔ اس کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ اپنا مذاق بھی اُڑا سکتا تھا۔

ہم اکثر اس مسئلہ پر بات کرتے تھے کے انسان کی زندگی میں بھوک زیادہ اہم ہے یا جنس۔ ایک دفعہ لنچ کے وقفہ کے دوران ہم باہر گئے تو کیفے ڈی خان کے قریب ایرانی ہوٹل کے سامنے (اب یہاں ایک پیٹرول پمپ واقع ہے) ایک ننگ دھڑنگ آدمی مُشت زنی کررہا تھا۔ خواتین بھی وہاں سے گزر رہی تھیں لہٰذا بہت Embarassing منظر تھا۔ ایرانی ہوٹل کے منیجر نے اپنے ایک بیرے کے ذریعہ اس پاگل کو ایک روٹی بھیج دی تا کہ اس کا خیال ہٹ جائے اور وہ روٹی کھانا شروع کردے۔ اس ننگ دھڑنگ آدمی نے روٹی بغل میں دبائی اور اپنا کام جاری رکھا۔ ہم دونوں بہت ہنسے اور ایک طرح سے طے پا گیا کہ بعض صورتوں میں جنس کو فوقیت حاصل ہے۔

مجھے سندھی تو آتی نہیں تھی لیکن منیر سے پوچھ پوچھ کر میں نے اس کی دو ایک کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا جو پاکستانی ادب میں شائع ہوئی تھیں۔ ''پاکستانی ادب'' کی ایڈیٹر ہماری دوست سعیدہ گزدر تھیں اور سید سبطِ حسن اس کے ایک طرح سے چیف ایڈیٹر یا سرپرست تھے۔

منیر ہمیں بہت مزے مزے کے قصے بھی سناتا۔ ایک دفعہ اس نے بتایا کہ وہ اپنے دوست اور سندھی کے مایہ ناز کہانی نویس عبدالقادر جونیجو سے ملنے اس کے گاؤں گیا جو تھرپارکر میں تھا۔ شام کے وقت منیر اور جونیجو آنگن میں بیٹھے باتیں

کررہے تھے کہ ایک سانپ نظر آیا۔منیر نے جونیجو سے کہا کہ آنگن میں سانپ گھوم رہا ہے۔ جونیجو نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔منیر نے دوبارہ کہا تو جونیجو بولا ''یہیں رہتا ہے!''

بقول منیر رات کو بستر بھی آنگن میں لگائے گئے۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی اور صبح ہوتے ہی اس نے نوشہرہ فیروز کی بس پکڑی۔

ایک قصّہ اس نے یہ سنایا کہ نواب شاہ میں ایک شخص کی شکل پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو سے بہت ملتی تھی اور سب لوگ اسے ''بھٹو'' کہہ کر چھیڑتے تھے۔کوئی بہت سیدھا سادھا آدمی تھا۔ایک دفعہ جب ذوالفقار علی بھٹو نواب شاہ آئے تو وہ شخص کسی طرح اگلی صف میں گھس گیا اور ذوالفقار علی بھٹو سے کہا کہ سب لوگ کہتے ہیں کہ میری شکل آپ سے بہت ملتی ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے فرمایا ''ہاں بابا بہت شوقین مزاج آدمی تھے۔'' وہ شخص اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ایک اور دلچسپ واقع اس نے سنایا کہ وہ اور اس کا عزیز دوست میر تھیبو حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن پر گھوم رہے تھے۔ حیدرآباد میں نوجوانوں کی یہ بھی ایک تفریح ہوتی تھی۔ اچانک میر تھیبو نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلانا شروع کردیا۔منیر نے اس سے پوچھا کہ کیا کررہے ہو۔ میر تھیبو اچانک چونک گیا۔ کہنے لگا میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں گرفتار ہوگیا ہوں اور ہزاروں افراد مجھے See off کرنے آئے ہیں اور میں ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہہ رہا ہوں۔ میر تھیبو سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سکریٹری تھا اور اس کے بیٹے کا نام بھی مانک ہے۔

اردو کی معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض کی منیر سے گاڑھی چھنتی تھی۔ جس زمانے میں منیر سوویت محکمہ اطلاعات میں ملازم تھا اور نارتھ ناظم آباد میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا، فہمیدہ ریاض اکثر وہاں چلی جاتیں۔ایک دفعہ منیر نے یہ قصّہ سنایا کہ فہمیدہ نے منیر کو بتایا کہ ظفر اُجن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا وہ اس سے شادی

کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا کروں؟ منیر نے جواب میں کہا یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ خود فیصلہ کریں۔ دوسرے دن فہمیدہ اور ظفر اُجن کی کورٹ میں شادی ہوگئی۔ میں نے یہ واقع اپنے دوست محسن کو سنایا جو اب جرمنی میں رہتا ہے تو وہ برجستہ بولا ۔''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یہ اتنا آسان ہے تو میں تو فہمیدہ کے پیر پکڑ لیتا۔''

بھٹو کے دور میں معروف کمیونسٹ لیڈر جام ساقی کے وارنٹ گرفتاری تھے اور وہ روپوش تھے۔ ایک دن منیر نے مجھ سے کہا کہ چلو جام سے ملنے چلتے ہیں ۔ وہ مجھے سینٹرل جیل لے گیا جہاں سرونٹ کوارٹر میں جام روپوش تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ جیل کے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے والا ایک باریش شخص درحقیقت جام ساقی ہے۔

بعد میں منیر نے گلبرگ میں کرایہ کا مکان لے لیا جو میرے گھر کے قریب واقع تھا۔ ان دنوں میں انچولی میں رہتا تھا۔ اکثر اس کے گھر چلا جاتا اس کا ایک ہی بیٹا تھا علی جو اس زمانے میں بہت چھوٹا سا تھا۔

منیر کی سالی کی شادی نسبتاً خوشحال گھرانے میں ہوئی تھی ۔ سوویت محکمہ اطلاعات کے بند ہونے کے بعد منیر کافی پریشان رہتا۔ پھر وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ ایک دن اطلاع آئی کہ اس نے خودکشی کرلی۔

(۲۷ مئی ۲۰۱۲ء کراچی)

”مونس“

نام تو سیّد سلطان حسن ہے لیکن خاندان اور دوستوں میں یہ مونس کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ ہم دونوں نے گرین وڈ اسکول میں پڑھا ہے۔

جب میں روسی محکمہ اطلاعات میں کام کرتا تھا تو یہ حکومت سندھ کے محکمہ اطلاعات میں پی آر او ہوتے تھے۔ میرے پاس کار ہوتی تھی اور میں اکثر اُن کے پاس چلا جاتا۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ میری گاڑی پر روسی سفارت خانہ کی نمبر پلیٹ ہوتی ہے اور تم سرکاری نوکر ہو۔ کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔

کمالِ بے نیازی سے بولے ”اگر تم سے روسی پوچھیں کہ میرے پاس کیوں آتے ہو تو کہہ دینا سرکاری محکمہ میں ایک Mole ہے، مجھ سے پوچھا جائے گا تو کہہ دوں گا کہ روسی سفارت خانہ میں میرا ایک Mole ہے۔“

یہ ترقی کرتے رہے۔ کبھی P.M. Secretariat، کبھی کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن، کبھی KESC میں اور کبھی PIA میں۔ ہماری دوستی میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ہمیشہ مدد کرنے کے لئے تیار۔ شادی نہیں کی ہے لیکن بلا کے حُسن پرست ہیں۔ بہت سی سہیلیاں ہیں۔

اُن کے گھر کا ماحول بھی بہت لبرل رہا ہے۔ سید سعید حسن کے بھانجے ہیں

جو طالب علم رہنما ہوتے تھے اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری اور جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں مجلس شوریٰ میں بھی رہے۔ اُن کی ممانی بلم آنٹی بڑے علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے بیچ لگژری ہوٹل کے پاس والے اپارٹمنٹ میں ہمیشہ گہما گہمی رہتی تھی۔ ہم لوگ اکثر وہاں کھانا بھی کھاتے تھے اور رات کو سو بھی جاتے تھے۔

مونس ممتاز مصور صادقین کے بہت قریب رہے اور خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے دوست عباس رضوی سے ملنے گئے جو رائٹر گلڈ میں کام کرتے تھے اور وہیں ایک کمرے میں سو جاتے تھے۔ بہت قلیل تنخواہ ملتی تھی۔ عباس کمرے میں نہیں تھے۔ اُن کی سفید چادر پر ایک Nude بنا کر چلے آئے۔ واپس آ کر عباس نے سر پیٹ لیا۔ اس کے پاس وہی ایک سفید چادر تھی۔ اب اسے کیسے اوڑھیں؟

مونس میں ایک خوبی اور بھی ہے۔ کوئی دوست رات کے تین بجے بھی فون کردے کہ طبیعت خراب ہے اور اسپتال جانا ہے، یہ پہنچ جائیں گے۔ درحقیقت انہیں نیند کم آتی ہے لیکن ہمیشہ چاق و چوبند رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کہنے لگے کہ لڑکپن میں ایک دفعہ انہوں نے اپنی امّاں سے ایک روپیہ مانگا۔ وہ کسی وجہ سے انہوں نے نہیں دیا۔ پھر زندگی بھر اُن سے پیسہ نہیں مانگا، خیال ہمیشہ رکھا۔

(۷رمئی ۲۰۱۱ء، کراچی)

پال براؤن (Paul Brown)

۱۹۹۷ء میں جب Financial Post میں بحیثیت سینئر رپورٹر کام کر رہا تھا تو Common Wealth Journalists Association کے تحت ماحولیات پر ایک ورکشاپ کا انعقاد ہوا۔ ڈیلی نیوز کے ایڈیٹر ایس ایم فضل اور سینئر صحافی ہمدان امجد علی مرحوم اس کے روحِ رواں تھے۔

یہ شاید ایک ہفتہ کی ورکشاپ تھی۔ میں نے بھی اپنا نام رجسٹر کرادیا۔ ورکشاپ گارجین اخبار کے لندن کے نامہ نگار پال براؤن کرا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولا Why are you here? (تم یہاں کیوں ہو؟) اس کی مراد تھی میں سینئر ہوں لہٰذا مجھے وہاں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا "I want to learn" (میں سیکھنا چاہتا ہوں)۔

پال براؤن ہمیں مختلف جگہوں پر جیسے کہ ساحل سمندر، فیکٹریوں وغیرہ میں لے جاتا اور پھر ہم سے ان موضوعات پر لکھنے کو کہتا۔ پھر وہ کاپیاں دیکھتا ہمیں ہماری غلطیاں بتاتا۔

وہ روزنامہ ''دی گارجین'' (The Guardian) کا بہت سینئر صحافی تھا اور Climate Change کا ماہر۔ اس موضوع پر اس کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی تھی۔ میری رپورٹوں سے وہ بہت خوش تھا اور کلاس میں اس کا تذکرہ بھی کرتا تھا۔

لندن روانگی سے ایک دن قبل میری اس سے Avari Hotel میں ملاقات ہوئی جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے کہا گارجین اخبار میں لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا

گارجین میں پاکستان کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے لیکن تم لکھو۔ میں تمہاری خبریں Edit کروں گا۔ یہ وہاں کوئی نہیں کرے گا۔ میرے پاس ملیر میں ایک Toxic Dump کے بارے میں پہلے سے خبر موجود تھی۔ وہ میں نے پال براؤن کو دے دی۔ اس نے مجھے اپنی Climate Change پر کتاب دستخط کر کے دی اور بہت سارے اخبارات جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا دے دیئے۔

کچھ دنوں بعد گارجین میں میری پہلی خبر شائع ہوئی لیکن ایک دلچسپ واقع ہوا۔ میں رپورٹر تھا اور شام کے وقت دفتر آتا تھا۔ رات گئے میرے ایک سب ایڈیٹر ساتھی نے پوچھا کہ مجھے وہ فیکس مل گیا جو لندن سے آیا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ لندن سے فون بھی آیا تھا۔

میں اپنے ایڈیٹر اسد کے پاس گیا اور پوچھا میرا لندن سے کوئی فیکس آیا تھا؟ کہنے لگے کہ ہاں اسے سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ یہ میری خبر کی Composed Copy تھی جو دوسرے دن کے اخبار میں آنے والی تھی۔ پال براؤن نے وہ پہلے ہی سے فیکس کر دی تھی۔

دوسرے دن کراچی کے متعلق پال براؤن کا فیچر شائع ہوا اور اس کے ساتھ ہی میری خبر بھی شائع ہوئی۔ ڈان اخبار نے اسے شائع کیا۔ اب تو کھلبلی مچ گئی۔ ڈان سے میرے دوستوں نے فون کیا کہ کیا یہ تم ہی ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں۔

میرا ایڈیٹر اسد بار بار مجھ سے پوچھتا کہ کیا آپ نے شاہ رُخ حسن اور توقیر مہاجر کو بتا دیا ہے کہ آپ گارجین کے لئے بھی لکھنے لگے ہیں؟ اس کا مطلب تھا کہ Financial Post میں ہوتے ہوئے گارجین میں لکھنے پر اعتراض ہوگا۔

میں نے کہا جب ملاقات ہوگی تو بتا دوں گا۔ شاہ رخ حسن اس وقت Financial Post کے Managing Director تھے اور اوپر کی منزل پر بیٹھتے

تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھے بلایا۔ وہاں توقیر مہاجر بھی بیٹھے ہوئے تھے جو ڈائریکٹر تھے۔ شاہ رخ حسن نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ بات درست ہے کہ آپ نے گارجین میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

کہنے لگے پاکستان میں گارجین کی Advertising کون کرتا ہے؟ میں نے جواب دیا مجھے علم نہیں۔ پھر دونوں نے تجویز پیش کی کہ پال براؤن سے کہو Advertising ہمیں دے دے۔ ہم دونوں برابر کے Partner بن جائیں گے۔

میں نے جواب دیا کہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے میں تو Free Lance کرتا ہوں۔ معاملہ ختم ہو گیا۔

۲۰۰۰ء میں، میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میرے ایک عزیز بھی برابر میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا جی چاہتا ہے لندن چلا جاؤں۔ طنزاً بولے ''آپ تو جاتے رہتے ہیں!'' مجھے بہت بُرا لگا۔

رات تقریباً دو بجے میں نے پال براؤن کو لندن فون کیا اور کہا میں وہاں آنا چاہتا ہوں۔ ایک خط برطانیہ کے ڈپٹی ہائی کمیشن میں گارجین کی طرف سے بھیج دو کہ مجھے ویزا دے دیں۔ اور اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دو۔ چند دن بعد Multiple Visa کا خط آ گیا۔ British Deputy High Commission فون کیا کہ ویزا فیس کتنی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھائی ہزار روپے ہے۔ میں فیس لے کر وہاں چلا گیا۔ پتہ چلا کہ Multiple Visa کی فیس تو چار ہزار ہے۔ سوچا اب واپس کون جائے۔ سنگل ویزا ہی لگوا لیتے ہیں۔ ویزا آفیسر کہنے لگا:

"Sir we have received the letter, you can collect

your passport at 12 O'clock"

فروری کا مہینہ تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بہت سردی ہوگی۔ رضا کے ساتھ لنڈا بازار گیا اور ایک بہت گرم اوورکوٹ (Over Coat) خرید لیا۔ ہزار روپے میں ملا۔ اسے ڈرائی کلین کرایا۔ ایک Exporter جاننے والا تھا، اس سے فیکٹری ریٹ پر دو چمڑے کے جیکٹ خریدے، ایک اپنے لیے، ایک پال براؤن کے لئے۔ نسرین کو گولڈن ہینڈ شیک کے پانچ چھ لاکھ روپے ملے تھے۔ ایک لاکھ روپے اُدھار لے لیے۔ ٹکٹ Off Season ہونے کی وجہ سے سستا مل گیا۔ Return Ticket خریدنے کے بعد 420 پونڈ بچے، سوچا بہت ہیں۔

دفتر سے چھٹی لے لی اور Emirate Airlines میں بیٹھ گئے۔ جب جہاز Heathrow Airport پہنچا تو Immigration Officer نے جو ایک کالی عورت تھی روک لیا۔

اس نے پوچھا تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں اور لندن میں کتنے دن رکنے کا ارادہ ہے؟

میں نے بتایا کہ 420 پونڈ ہیں اور چھ مہینے رکنے کا ارادہ ہے۔

کہنے لگی اتنے پیسوں میں گزارہ کیسے کرو گے؟

میں نے کہا اوّل تو میری بیوی بہت امیر خاتون ہیں، دوسرے گارجین میں مضمون لکھ لوں گا۔

بولی "Now I will write for the Guardian"

(اب میں گارجین میں لکھوں گی)

میں نے سوچا پتہ نہیں کیا معاملہ ہے۔ دو تین گھنٹوں تک روکے رکھا۔ پتہ چلا کراچی کے ڈپٹی ہائی کمیشن فیکس کر رہی ہے اور وہاں دفتر بند ہے۔

میرا سردی کے مارے بُرا حال تھا۔ صرف قمیض پہنی ہوئی تھی باقی سامان Luggage میں تھا۔

کوئی تین گھنٹے بعد اس نے جانے کی اجازت دی۔ چائے پیش کی اور پوچھا "How do you feel?" تاکید کی کہ برطانیہ میں، میں نوکری نہیں کروں گا، وعدہ کرلیا۔

ڈاکٹر حضرت علی کو جو ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا اور میرا پرانا دوست تھا، فون کیا اور کہا کہ میں آ گیا ہوں اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ آپ کے پاس ٹھہرنا ہے۔

وہ بولے ''میں آپ کو نہیں جانتا لیکن ٹھہرنے کا بندوست ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''جب جانتے نہیں تو ٹھہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' فون بند کردیا۔

لاشاری کو فون کیا۔ اس نے کہا ایئر پورٹ سے ٹیوب ملے گی۔ ایک طرف کا ٹکٹ لے لیں اور Earls Court پر اُتر جائیں۔ وہاں ایک ہوٹل ہے Rasool Hotel، اس میں ٹھہر جائیں۔ میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ جب میں Earls Court کے اسٹاپ پر اُترا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بڑا خوبصورت علاقہ تھا۔ لوگ چھتری لگائے آ جا رہے تھے۔ ''رسول ہوٹل'' آسانی سے مل گیا۔

صاف ستھرا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی نے پاسپورٹ دیکھا اور بتایا کہ 50 پاؤنڈ روز آنہ کرایا ہے، ناشتہ ملے گا لیکن کھانا باہر کھانا ہے۔

پال براؤن کو فون کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ پہلی فرصت میں ٹیوب کا ماہانہ پاس بنوا لو۔ دس پاؤنڈ کا بنے گا اور پھر گارجین کا پتہ سمجھایا۔

دو تین دن گزر گئے۔ لاشاری صاحب غائب۔ ایک انگریز کونسلر جو لاشاری

کا دوست تھا، ہوٹل ملنے آیا اور بولا کمرے میں بیٹھنے کے بجائے نیچے لاؤنج میں بیٹھا کرو اور کوئی کتاب پڑھا کرو۔ لاشاری بھی کونسلر تھا میں نے کہا میرے پاس پیسے کم ہیں اور لاشاری صاحب تو تشریف ہی نہیں لا رہے ہیں۔ انہی نے شاید لاشاری کو فون کیا۔ وہ شام کے وقت اپنی گاڑی لے کر آئے، اس میں میرا سامان رکھوایا اور مجھے Lyndon میں جو لندن کے مضافات میں تھا منتقل کر دیا۔ وہاں ان کا ایک ٹاؤن ہاؤس ٹائپ کا گھر تھا جس میں ایک کشمیری لڑکا پہلے سے رہتا تھا۔ جان میں جان آئی۔

پال براؤن کو دوبارہ فون کیا تھا۔ اس نے گارجین کا پتہ سمجھایا۔ میں ٹیوب کا ٹکٹ خرید کر جو دوطرفہ 10 پاؤنڈ کا تھا لے کر وہاں پہنچ گیا۔

پال براؤن نے اپنی سیٹ کے سامنے والی میز پر مجھے بٹھا دیا۔ وہ گارجین کے Environmental Editor کی تھی جو ایک Assignment پر ہندوستان گیا ہوا تھا۔ بولا:

"This is your seat, this is International Phone, you can makes as many calls as you like and write"

(یہ تماری سیٹ ہے۔ یہ انٹرنیشنل نمبر، جتنے چاہے فون کرو اور لکھو)

پال براؤن کی ایک سیکریڑی بھی تھی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں۔ اس کا کام پال براؤن کے فون کالز سننا تھا اور اسے بتانا تھا جہاں بھی وہ ہو۔ وہ میرا کام بھی کرنے لگی۔

میں نے سوچا ایک اسٹوری Fundamentalism پر کرتے ہیں۔ تین چار سوال لکھ کر ڈان اخبار کے محمد علی صدیقی کو جو بہت سینئر صحافی ہیں اور جن سے میں ۱۹۷۳ء سے واقف ہوں بھیجے، گارجین کے لیٹر پیڈ پر۔

ان میں، میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ بنیاد پرستی (Fundamentalism) Christanity سے ماخوذ ہے۔ شروع میں تو جواب نہیں آیا۔ جب دو تین فیکس اور E-mail کئے تو صدیقی صاحب کا جواب آیا کہ یہ بہت گہرے سوال ہیں لیکن چونکہ وہ عمرہ پر جا رہے ہیں لہٰذا وہ واپس آ کر جواب دیں گے۔ سخت مایوسی ہوئی۔

میں نے پال براؤن سے ایک دن کہا کہ میں گارجین کے Foreign Editor سے ملنا چاہتا ہوں۔ پال براؤن نے کہا ابھی وہ کمرے میں نہیں ہے، تم اپنا کام کرو، جب وہ آئے گا تو ملاقات کر لینا۔ میں کوئی اسٹوری ٹائپ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پال براؤن نے آ کر بتایا کہ Foreign Editor آ گیا ہے۔ میں اٹھنے لگا تو بولا "No, he will come to you, write your story" (نہیں تم اپنی اسٹوری لکھو، وہ خود آئے گا)

جب میں نے اپنا کام ختم کر لیا، تو Foreign Editor میرے پاس آیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ نوجوان آدمی تھا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا میں پاکستان کے Heritage پر لکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔

ایک دن علی احمد خان کے پاس گیا جو BBC میں کام کرتے تھے، بولے تعجب ہے کہ ''آپ کو گارجین میں بٹھا رہے ہیں۔ یہاں تو Stringers کو Pub سے رخصت کر دیتے ہیں۔ عباس ناصر اور شفیع نقی جامعی سے ملاقات ہوئی۔ شفیع نقی جامعی سے میں نے کہا مجاہد بریلوی نے کہا تھا آپ سے ضرور ملیں لیکن میں نے جواب دیا تھا کہ جماعتی ہے نہیں ملوں گا۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔

جامعی نے کہا آپ نے پہچانا نہیں ہوگا۔ پہلے میری زلفیں ہوا کرتی تھیں۔

ایک دن میں لاشاری کے گھر میں سو رہا تھا کہ واجد شمس الحسن کا فون آیا۔ بہت غصہ میں بولے ''ملے بغیر جا رہے ہیں۔''

میں بولا، میں نے تو لاشاری صاحب سے کہا تھا کہ آپ سے ملوائیں مجھے۔
انہوں نے فون نمبر ہی نہیں دیا۔

بولے ''واپسی کب ہے؟''

میں نے بتایا کل واپس جارہا ہوں۔

کہنے لگے ''اچھا ایئرپورٹ پر آؤں گا۔''

پتہ نہیں آئے یا نہیں، ملاقات نہیں ہوئی۔

واپس آکر میں نے اپنے اخبار کے ایڈیٹر اسد سے پوچھا تم نے میرے گھر پر خط کیوں بھیج دیا تھا کہ فوراً واپس آجاؤ ورنہ نوکری سے نکال دیا جائے گا؟

بولا، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا یہ چیف رپورٹر شیخ تاج محمد نے کیا تھا۔

میں نے Financial Post سے استعفیٰ دے دیا اور سلطان لاکھانی کا Business Today جوائن کرلیا جو نیا نیا نکلا تھا۔

(۲۴ر فروری ۲۰۱۱ء، کراچی)

نخبت ہمیں سونے نہیں دیتیں

نخبت ابھی فقط ۳۱ سال کی ہیں۔ بی بی سی اسلام آباد کی اُردو سروس میں کام کرتی ہیں۔ آواز میں جادو ہے۔ خبریں پڑھتی ہیں اور دستاویزی فلمیں بناتی ہیں۔ ذہین آنکھیں، خوبصورت ہاتھ پاؤں اور کام کی دھنی۔ خوبصورت اور کسے کہتے ہیں؟ لیکن ماننے کے لئے تیار نہیں کہ وہ خوبصورت ہیں۔ کہنے لگیں اسلام آباد میں تو ہم سے کسی نے نہیں کہا کہ ہم خوبصورت ہیں۔

کافی دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ کراچی آرہی ہیں تا کہ تھرپارکر جا کر ایک دستاویزی فلم بنائیں۔ ساتھ ساتھ دھمکی بھی دے رہی تھیں کہ ہمیں تھکا دیں گی۔ ظاہر ہے اس دھمکی کا ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا کیونکہ ابھی تک تو کوئی ملا نہیں جو ہمیں تھکا دے۔

لیکن جب ہم اُن کے ہمراہ تھرپارکر کے صدر مقام مِٹھی پہنچے جس کے معنی ہمارے دوست گلاب رائے میٹھی بتاتے ہیں تو نخبت کے جوہر کھلے۔

تقریباً ایک بجے رات ہم لوگ مِٹھی پہنچے اور نخبت نے دوسرے دن کا پروگرام بنایا۔ ان کے ہمراہ گلاب رائے، فیضان اور مجھے کام کرنا تھا۔ حکم دے دیا کہ صبح چار بجے نکلنا ہے۔ مارے خوف کے دل بیٹھ گیا۔ چار بجے تو ہم سونے کے لیے لیٹتے ہیں۔ لیکن خوف کا اظہار نہیں کیا۔ چار بجے صبح نکلنے کا مطلب ہے آپ تین بجے اُٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی وجہ سے تھردیب کے گیسٹ ہاؤس میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ باورچی کو بھی صبح سویرے اُٹھنا پڑا تا کہ چائے ناشتہ بنا سکے اور ڈرائیور بھونبرو کو

ساڑھے تین بجے صبح حاضر ہونا پڑا۔

میں نے نخبت سے پوچھا کہ اتنا سویرے اُٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟

انہوں نے بتایا کہ تھر پارکر بہت پھیلا ہوا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں بہت وقت لگتا ہے اور یہ اپریل کا مہینہ ہے۔ دھوپ تیز ہے اور صبح دس بجے کے بعد بلاسٹ ہوتا ہے۔ یہ لفظ بلاسٹ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ہم کراچی کے رہنے والے ہیں اور بلاسٹ کے معنی صرف بم دھماکے سمجھتے ہیں جو بھینگی آنکھوں اور مکار مسکراہٹ والا جنرل ضیاء الحق سارے ملک کو ورثہ میں دے گیا ہے۔ پتہ چلا کہ فلم بنانے کے عمل میں بلاسٹ کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تیز دھوپ کی وجہ سے تصویر کا پھٹ جانا۔

نخبت کو یہ فکر لاحق تھی کہ تھر پارکر کی تیز دھوپ میں اُن کا رنگ کالا ہو جائے گا۔ ہم نے سمجھایا کہ کالا ہونا تو کوئی بُری بات نہیں بلکہ اس کا اپنا الگ حسن ہے۔ مثال دی کہ اوباما کالا ہے لیکن اپنے لیاری کے مکرانیوں کی طرح اسمارٹ اور خوبصورت ہے۔ کچھ بولیں نہیں۔

اب روز یہ معمول بن گا کہ صبح چار بجے گیسٹ ہاؤس سے نکل جانا ہے۔ دو تین دفعہ نگر پارکر گئے، پھر اسلام کوٹ، ڈیپلو اور دیگر جگہوں پر گئے جہاں سے واپسی دیر سے ہوتی اور سونے کا موقع بارہ ایک بجے ملتا۔ سونے پہ سہاگہ یہ مٹھی میں رات ایک بجے سے تین بجے تک Load Shedding ہوتی ہے اور بجلی غائب ہو جاتی ہے۔ ایک تو گرمی، اوپر سے مچھر کی بھرمار۔ نتیجتاً ہمارا معمول یہ ہوگیا کہ بجلی جانے کے بعد آنگن میں آ کر بیٹھ جاتے اور خمار آلود ہوا اور چاند سے لطف اندوز ہوتے۔ لیکن باہر بھی مسائل کم نہیں تھے۔ تھر دیب کے گیسٹ ہاؤس میں بھانت بھانت کے مہمان قیام پذیر ہوتے تھے۔ ایک صاحب جو کسی NGO کے اہل کار تھے بغیر

اجازت ہمارے پاس آبیٹھے اور باتیں شروع کردیں۔ پہلے تو اپنا تعارف کرایا کہ کس ادارے میں Finance Manager ہیں۔ پھر ہم سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

ہم نے بتایا کہ دی نیوز میں کام کرتے ہیں۔

بولے عہدہ کیا ہے؟

ہم نے کہا نمائندہ خصوصی ہیں۔

کہنے لگے کسی خاص مشن پر تھرپارکر آئے ہیں۔

ہم نے کہا بس ایسے ہی آگئے۔

کہنے لگے آپ کو بیر Beer بہت پسند ہے؟

ہم نے کہا "جی" شاید انہوں نے نخبت کو بیر لیتے دیکھ لیا تھا۔

اب انہوں نے Murree Brewery کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ۱۸۸۵ء میں بنی تھی۔ اور بیس سالہ پرانی وسکی بھی مل جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ طبیعت کچھ بوجھل ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہوا اور چاندنی کا سارا مزا کرکرا ہوگیا۔ ہم اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ سوچا مچھر کاٹیں گے لیکن سوالات تو نہیں کریں گے۔

ٹھیک چار بجے صبح تیار ہو گئے اور ڈیپلو کی طرف نکل گئے۔ وہاں ریت کے خوبصورت ٹیلے ہیں جو طرح طرح کی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ہم نے نخبت کو بتایا کہ کئی سال پہلے ہم نے اپنے ایک مضمون میں ان ٹیلوں کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ Feminine ہیں لیکن میگزین کی خاتون ایڈیٹر نے اس لفظ کو بدل کر Poetic کردیا۔ نخبت نے تعجب کا اظہار کیا اور زیادہ تعجب اس بات پر کیا کہ ایک خاتون نے لفظ Feminine کو Poetic کردیا۔

فلم بنانے میں نخبت بہت تفصیل میں جاتی ہیں۔ بعض اوقات الجھن بھی

ہونے لگتی ہے۔ لیکن کام کے ساتھ ساتھ خوب مزا بھی لیتی ہیں۔ چنانچہ نہ صرف ریت کے ٹیلوں کی فلم بنائی بلکہ ان پر خوب چلی پھریں، پھسلیں اور خوب ریت اُڑائی۔

رات جب گیسٹ ہاؤس پہنچے تو ان کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ کہنے لگیں پیروں میں بہت درد ہے اور سوج گئے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنی خدمات پیش کیں اور کہا ہم دبا دیتے ہیں۔

کہنے لگیں ''معافی دیجئے!''

دل ٹوٹ سا گیا۔

نخبت کی باتیں بھی دلچسپ ہیں۔ کہنے لگیں ہماری ایک بھابھی لکھنؤ کے کسی نواب گھرانے کی ہیں اور گفتگو کرتے وقت ''ہم'' کا صیغہ استعمال کرتی ہیں۔ ان کا ایک چھ ماہ کا بیٹا ہے جس کا نام عبداللہ ہے۔ ایک بار ہماری بھابھی کہنے لگیں انہیں نیند آرہی ہے۔ ہم نے پوچھا ''کیوں؟''

کہنے لگیں ''عبداللہ ہمیں سونے نہیں دیتے۔''

ایک اور دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگیں ایک دن ہم کھانا کھا رہے تھے کہ کہیں سے بلی آ گئی۔ اب ہماری بھابھی اس سے کہہ رہی ہیں ''دیکھئے آپ یہاں سے چلی جائیے۔ یہاں آپ کا کوئی کام نہیں۔''

نخبت دل کی بھی بڑی نرم ہیں۔ ہم نتھو کھتری کے یہاں گئے جو پشت ہا پشت سے کپڑے پر بلاک پرنٹنگ کرتا ہے۔ ۴۷ سال کا ہے اور درحقیقت میں ایک آرٹسٹ ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا اگر اس کی بیوی دس ہزار روپے کی چیز بھی مانگے تو وہ فوراً دلوا دیتا ہے۔ کہنے لگا سب سے بڑا رُتبہ بھگوان کا ہے، اس کے بعد بیوی کا۔ نخبت کے پٹ پٹ دو آنسو ٹپک پڑے۔

حافظہ بھی بلا کا ہے۔ نتھو کے یہاں جاتے وقت راستے میں ہم نے انہیں بتایا

کہ بہت عرصہ ہوا راجیش کھنہ کی ایک فلم دیکھی تھی جس میں شرمیلا ٹیگور نے ایک طوائف کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں ایک جگہ راجیش کھنہ نے دولفظ بولے، بہت پیار سے۔ وہ تھے ''گایئے نا۔''

کہنے لگیں۔ فلم کا نام ''امر پریم'' تھا اور شرمیلا ٹیگور ایک گانا جس کے بول تھے ''رینا بیتی جائے'' گاتے گاتے رُک گئی تھیں تب راجیش کھنہ بولے ''گایئے نا۔''

ایک دن نگر پار سے واپس آتے ہوئے میں نے نخبت سے پوچھا ''آپ نے فلم 'اجازت' دیکھی ہے۔''

کہنے لگیں ''جی''۔

میں نے پوچھا ''چینی کم'' دیکھی ہے؟''

کہنے لگیں ''جی''۔

میں نے کہا کہ امیتابھ بچن کا رول اتنا اچھا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ہوں۔ اور ہیروئن بھی کیا غضب کی ہے اور کہانی کیا خوب ہے۔ پھر میں نے کہا مجھے یوں لگتا ہے اس فلم کا خیال "Say Hello to Yesterday" سے لیا گیا ہے جو میں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں دیکھی تھی۔

ایک دن نخبت نے پوچھا ''آپ کو کیا کہا کریں۔''

میں نے کہا سر (Sir) مت کہا کرو بوڑھاپے کا گمان ہوتا ہے۔ چاہے دادا کہہ دیا کرو۔

یہ سوچ کر جی بہت خوش ہوا کہ ہم دادا کے نام سے پہچانے جائیں گے۔

مٹھی، ۱۴/ اپریل ۲۰۱۰ء

احساسِ جرم

انچولی میں میرا اور نسرین کا گھر آمنے سامنے تھا۔ اُن دنوں وہ فلپس (Philips) میں کمپیوٹر آپریٹر تھی۔ ہم لوگ لیاقت آباد سے انچولی نئے نئے شفٹ ہوئے تھے۔ اکثر اس پر نظر پڑ جاتی۔

پھر ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا۔ وہ بڑی سادہ سی لڑکی تھی لیکن اس میں ہمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

میں اُن دنوں شدید قسم کے ڈپریشن کا شکار تھا۔ اپنے دوست سلمان کی مالی مدد سے پیپلز کالونی (People's Colony) میں پی وی سی (PVC) کا ایک چھوٹا سا پلانٹ لگالیا تھا اور Horticulture کا کام بھی شروع کیا تھا لیکن مجھے تجارت کی الف بے بھی معلوم نہیں تھی۔ پی وی سی کا پلانٹ چار افراد کی شراکت میں لگا تھا لیکن آمدنی ایک پیسے کی بھی نہیں ہوئی۔ البتہ Horticulture کے کام میں جو میں اکیلا کرتا تھا کچھ پیسہ کمایا۔

میرے ماموں اسلام حسین نے میری والدہ سے کہا شاہد کی شادی کردیں تو ڈپریشن دور ہوجائے گا۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبل ازیں ایک لڑکی سے میرا نکاح ہوا تھا لیکن رخصتی سے پہلے ہی میری طبیعت خراب ہوگئی اور اُن لوگوں نے نکاح توڑ دیا۔ وہ نکاح ایک طرح کا Trap تھا۔

میری بہنوں کو نسرین بہت پسند آئی۔ میری چھوٹی بہن عذرہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں نے شادی نہیں کی تو وہ خودکشی کرلے گی۔

نسرین ہمارے گھر آئی ۔ ایک دفعہ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ میرا گھر جنت بنادے گی۔نسرین نے واقعی گھر گھرستی کی اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۳ء کو عزیز بھٹی پارک کے قریب واقع Customs Club میں ہم رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔گو پی وی سی پلانٹ لگ چکا تھا لیکن آمدنی کچھ بھی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے شادی کے لیے سلمان سے پھر قرض لیا۔ شادی پر کل ۶۰،۰۰۰ (ساٹھ ہزار) روپے خرچ ہوئے ۔ اس زمانے میں ساٹھ ہزار بڑی رقم ہوتی تھی ۔ بڑے اہتمام کے ساتھ شادی ہوئی۔

نومبر ۱۹۸۳ء میں ہماری بیٹی زویا پیدا ہوئی اور ڈیڑھ سال کے وقفہ کے بعد طہٰ پیدا ہوا۔ زویا کریم آباد پر واقع آغا خان اسپتال میں پیدا ہوئی اور جوں ہی نرس نے اسے بستر پر لٹایا اس نے چاروں طرف آنکھیں گھما کر دیکھا۔ ہماری خالہ رئیسہ خاتون بولیں ''یہ بچی تو بڑی تیز نکلے گی۔ ابھی سے سب کا جائزہ لے رہی ہے۔''

زویا واقعی بڑی ہونہار بیٹی نکلی۔ اس نے گھٹنیوں چلنا بھی نہ سیکھا تھا کہ ایک دن اچانک کھڑی ہوگئی اور چلنا شروع کردیا۔

وہ بچپن میں تصویریں بناتی، کہانیاں لکھتی ، مباحثوں اور ٹیبلو میں حصّہ لیتی اور کلاس میں پوزیشن بھی لاتی ۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں ''دی مسلم'' کے بچوں کے صفحہ پر بھی شائع ہوئیں۔

''دی مسلم'' میں میں نے تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا ۔ میں بزنس ڈیسک (Business Desk) پر کام کرتا تھا لیکن ہمارے ایڈیٹر سلامت علی بڑے Assignments پر مجھے بھیجتے ۔ مثلاً جب امریکہ کا بہت بڑا انرجی وفد (Energy Delegation) پاکستان آیا تو اسے Cover میں نے کیا۔

میں نے تجویز پیش کی کہ بزنس کے صفحات کے لیے چیدہ چیدہ شخصیات سے انٹرویو کرتے ہیں۔ سلامت علی صاحب نے وہ تجویز فوراً منظور کرلی اور میں نے بہت سی اہم شخصیات کے انٹرویو کیے۔ اس کے علاوہ میں میگزین میں بھی لکھتا تھا ایک مضمون کے عوض ۳۰۰ روپے ملتے تھے۔

اسی اثناء میں میرا اپنے انچارج سے جھگڑا ہوگیا اور مجھے نائٹ شفٹ بھیج دیا گیا۔

میری طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہوئی اور ایک دن بغیر وجہ بتائے ''دی مسلم'' سے فارغ کردیا گیا میرے واجبات کا چیک دے دیا گیا جو ۸۵۰۰ (ساڑھے آٹھ ہزار) روپے پر مشتمل تھا لیکن وہ مسلسل Bounce ہوا۔ حتٰی کہ ہم لوگ کراچی چلے آئے۔

ایک دن کراچی پریس کلب میں بیٹھا ہوا تھا کہ یوسف لودھی (وائی ایل) میرے پاس آئے اور بولے ''یہ ہے صحیح معنوں میں Intellectual!'' پھر بولے ''آج کل آپ کیا کررہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''کچھ نہیں!''

بولے ''میرے ساتھ چلیں!''

باہر ایک رکشہ اُن کا انتظار کررہا تھا۔ وہ مجھے سندھ ٹریبون (Sindh Tribune) نامی اخبار میں لے گئے اور کہا آج ہی سے کام شروع کردیں۔ وہ تھے تو اعلیٰ پائے کے کارٹونسٹ لیکن سندھ ٹریبون کے ایڈیٹر تھے۔ یوسف شاہین اس اخبار کے مالک تھے۔ وہ سندھی اخبار ''برسات'' کے بھی مالک تھے اور سینیٹر (Senator) بھی تھے۔

نواز شریف کا دور حکومت تھا اور کراچی میں فوجی آپریشن ہورہا تھا۔ سردیوں

کے دن تھے۔ سندھ ٹریبون کے نیوز ایڈیٹر جاوید نے وائی ایل (YL) سے پوچھا
''کیا پرائم منسٹر کراچی میں ہیں؟''

وائی ایل بولے ''وہ کوئی گدھا ہے؟ اتنی سردی میں کراچی آئے گا!''

وائی ایل بلا کی مہ نوشی کرتے لیکن دل کے بہت اچھے تھے۔ وہ ہمیشہ بوسکی کی قمیض پہنتے حالانکہ دیکھنے سے پتہ چل جاتا کہ وہ اب کافی گل چکی ہے۔

اسی اثناء میں مجھے کراچی سے شائع ہونے والے اخبار ''فائنشل پوسٹ'' (Financial Post) میں بہتر نوکری مل گئی۔ میں یوسف شاہین کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ میں کل سے نہیں آؤں گا۔ بولے ''ہمارے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ جب چاہیں واپس آجائیں۔''

فنانشل پوسٹ میں میں سینئر رپورٹر تھا۔ اس اثناء میں Common-wealth Journalists Association کی جانب سے کراچی میں ماحولیات (Environment) پر ایک ورکشاپ ہوئی جسے مقتدر روزنامے ''دی گارجین'' (The Guardian) کے لندن کے نامہ نگار پالِ براؤن (Paul Brown) نے Conduct کیا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ پال براؤن بولا "Why are you here?"

اس کا مطلب تھا میں کافی سینئر صحافی ہوں جبکہ ورکشاپ نسبتاً جونیئر صحافیوں کے لیے تھی۔

میں بولا ''"I want to learn!"

وہ بہت خوش ہوا۔ یہ گورے اس بات سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ آپ تعلیم حاصل کریں خواہ آپ کی عمر کچھ بھی ہو۔

پال براؤن ہمیں مختلف جگہوں پر لے جاتا مثلاً ساحلِ سمندر، چمڑے کی

فیکٹری وغیرہ۔ پھر ہم سے کہتا کہ قلم سے اسٹوری لکھو۔ اگلی کلاس میں وہ بتاتا کہ کس نے کیا غلطیاں کی ہیں۔ وہ میرا بڑا مداح ہوگیا تھا۔ اور کلاس میں برملا اس کا اظہار کرتا۔ بہت سادہ لیکن اصول پسند آدمی تھا۔

وہ Climate Change کا ماہر تھا اور اس نے مجھے اپنی کتاب دستخط کرکے دی۔ ورکشاپ کے خاتمے کے بعد جب اس کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں اس کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہوٹل آواری ٹاورز (Hotel Avari Towers) میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے وہاں بلالیا۔ انٹرویو کے بعد میں نے اس سے کہا کہ میں ''دی گارجین'' میں لکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے حامی بھرلی۔ کہنے لگا۔ "You write for us. No one will edit your stories there. I will edit them" - میں نے اسے اپنی دو اسٹوریز دے دیں۔ کچھ دنوں بعد روزنامہ ''ڈان'' میں پال براؤن کی اسٹوری شائع ہوئی جس کے ساتھ ساتھ میری بھی دو اسٹوریز شائع ہوئیں۔ ڈان سے دوستوں کے فون آنے لگے کہ کیا میں نے ''دی گارجین'' جوائن کرلیا ہے ؟ میں نے کہا ہاں حالانکہ میں Free Lancing کررہا تھا۔

نسرین میری کامیابیوں سے بہت خوش تھی ۔ ادھر ڈیوٹی فری شاپس (Duty Free Shop) کی نج کاری کا سلسلہ چل رہا تھا۔

وہ وہاں پر Computer Programmer کے طور پر کام کرتی تھی۔ نج کاری کے بعد اس نے گولڈن ہینڈ شیک (Golden hand shake) لے لیا اور اسے پانچ چھ لاکھ روپے ملے۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ''میں بہت تھک گئی ہوں۔ اب آپ نوکری کریں۔''

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں ۔ میں ابھی تھکا نہیں ہوں۔''

نسرین کی بہت خواہش تھی کہ اس کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔
اور درحقیقت اس کی محنت کے کارن زویا ڈاکٹر بن گئی، طہٰ انجینئر اور علیزہ نے بی کام کرلیا اور آرٹ اسکول میں بھی داخلہ لے لیا۔

نسرین کا وزن بڑھتا جارہا تھا۔ میں بہت کہتا کچھ چلا کرو لیکن اس کے بازو اور پیروں میں بہت درد ہوتا تھا۔ وہ حساس بھی بہت تھی۔ ساری عمر اس نے لوگوں کی خدمت کی لیکن دھوکے کھائے۔ اس نے مذہب میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ نماز پڑھتی، قربانی دیتی اور مجالس میں شریک ہوتی۔

آخری زمانے میں میں اسے تھر پارکر گھمانے لے گیا۔ بہت خوش ہوئی اور تھر دیپ میں کام کرنے والی کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہوگئی۔

میں نے اس سے کہا ہم تھر میں گھر بنائیں گے۔ بہت خوش ہوئی۔

جس رات وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہم تقریباً ایک بجے رات تک باتیں کرتے رہے۔ منصوبے بناتے رہے کہ تھر میں گھر بنائیں گے۔ مجھ سے کہنے لگی۔
''مینا سات طرح کی آوازیں نکالتی ہے۔''

اسے پرندوں سے بہت محبت تھی۔ روٹی کے ٹکڑے بچ جاتے تو انہیں روزانہ کبوتروں کو ڈالتی جو بڑے اطمینان سے ہماری گیلری میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ انہوں نے انڈے اور بچے بھی دیئے ہوئے تھے۔

تقریباً تین بجے نسرین کی طبیعت خراب ہوئی۔ ہم لوگ اسے لے کر اسپتال بھاگے۔ چار بجے اس کا انتقال ہوگیا۔

(۲۰رمئی ۲۰۱۲ء کراچی)

شاہد حسین 14 ستمبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید محمد وصی محکمہ جنگلات میں رین فارسٹ آفیسر تھے۔ چھے بہنوں اور تین بھائیوں میں وہ سب سے بڑے ہیں۔ بچپن میں وہ شرمیلے اور کم گو ہوا کرتے تھے۔ خاموش طبیعت کی وجہ مطالعہ تھا، دراصل ان کی والدہ اور ماموں کو ادب سے گہرا شغف تھا۔ اسکول ہی کے زمانے میں وہ اردو ادب کے تمام بڑے ناول نگاروں اور شعراء کو پڑھ چکے تھے۔

شاہد حسین کھیلوں میں کافی متحرک تھے۔ انھوں نے کرکٹ، ہاکی، اور شطرنج سمیت، تمام کھیلوں میں حصہ لیا۔ وہ اچھے طالب علم تھے اور ریاضی ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ انھوں نے گرین وڈ اسکول سے 1966ء میں میٹرک کیا۔ وہ سائنس کے طالب علم تھے۔ پہلے ڈی جے کالج میں داخلہ لیا، لیکن کالج گھر سے دور تھا اس لیے ٹرانسفر کروالیا اور سراج الدولہ کالج سے 69ء میں انٹر کیا۔ پھر انھوں نے جامعہ کراچی کے فزیولوجی ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا، تاہم طلبہ سرگرمیوں، گرفتاری اور گھریلو مسائل کے باعث ماسٹرز نہیں کر سکے۔ 68ء میں وہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن بنے اور 1969ء میں این ایس ایف کی سینٹرل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ اُن کے بہ قول 69-1968ء میں ایوب خان کے خلاف چلائی جانے والی تحریک میں طلبہ، خاص کر این ایس ایف نے کلیدی کردار ادا کیا۔ 1971ء میں جب مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی گئی تو بائیں بازو کی جماعتوں (جن میں طلبہ تنظیمیں بھی شامل تھیں) نے جنرل یحییٰ خان کے خلاف کئی پمفلٹ نکالے۔ شاہد حسین کے بہ قول "ہم نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے مظالم کے خلاف ایک پمفلٹ نکالا جائے۔ وہ پمفلٹ میں نے ہی لکھا۔ انٹیلی جنس والوں نے مجھ سے پوچھ تاچھ کی، اور یوں میں ان کی نظروں میں آ گیا۔ بعد میں مجھ سمیت کئی طلبہ اور سیاسی کارکن گرفتار ہوئے۔ اس وقت میری عمر 19 سال تھی۔" تاہم تین مہینے بعد حکومت ختم ہوگئی اور یوں وہ رہا ہوئے۔ جیل سے رہائی ملی تو معاشی مسائل نے انھیں اپنے چنگل میں لے لیا۔ یوں تعلیم ادھوری چھوڑ کر مجبوراً نوکری کی تلاش شروع کرنی پڑی۔ انہیں سوویت انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی۔ بہ قول انُ کے "وہاں ہم بین الاقوامی اُمور پر لکھا کرتے تھے اور وہ تحریریں مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی تھیں"۔ وہ 1980ء تک اُس ادارے سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصے فری لانسر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک رسالے "تھرڈ ورلڈ انٹرنیشنل" سے بطور سب ایڈیٹر منسلک ہوگئے۔ پھر روزنامہ "بزنس ریکارڈر" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1989ء میں وہ "پاکستان اینڈ گلف اکنامسٹ" سے وابستہ ہوگئے۔ پھر "ڈیلی نیوز" کا حصہ بن گئے۔ کچھ عرصے بعد اسلام آباد چلے گئے اور وہاں روزنامہ "دی مسلم" میں کام کرتے رہے۔ تین سال بعد کراچی واپسی ہوئی تو "فنانشل پوسٹ" سے منسلک ہوگئے۔ ایک سال "بزنس ٹوڈے" سے وابستہ رہے۔ پھر "ڈیلی ٹائمز" کا حصہ بن گئے اور چار سال وہاں کام کیا۔ چھ ماہ میگزین "ہیرالڈ" سے وابستہ رہے۔ گذشتہ تین سال سے وہ "دی نیوز" سے خصوصی نامہ نگاری کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ اس دوران غیر ملکی رسائل میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا، برطانوی غیر ملکی رسائل میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا، برطانوی میگزین "گارجین" میں ان کی تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت وہ انڈیا سے نکلنے والے ایک ہفت روزہ میگزین "دی سنڈے انڈین" کے پاکستان میں بیورو چیف بھی ہیں۔ اپنے طویل کیریئر میں وہ اُردو اور انگریزی، دونوں ہی زبانوں کے اخبارات ورسائل سے منسلک رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی اخبارات میں رپورٹر کو زیادہ جگہ ملتی ہے اور تنخواہیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، جُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪٽي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنى e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو ڪُـوڙو آهـي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪـو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي -non commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيِٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ پلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي ته هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن به رُڪاوٽَ کي نه مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجههَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهه ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو ته:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛
... ...
ڪالههَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهه نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نه آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَّ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ
اِن حسابَ سان اڄ‌ڪالهه ٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ ته
”هاڻي ويڙهه ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نه
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙهڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪِجي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙهَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَڙهَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽَل گهرج necessity unavoidable سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها ٿوڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَـنَ پَـنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)